نومبر ۱۹۶۵ء

جلد ۶۴   عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے   قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۴	نومبر ۱۹۶۵ء	عدد ۳

چندہ سالانہ — دفتر رسالہ ترجمان القرآن — قیمت فی پرچہ

سات روپے — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور — ۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مشہور مؤرخ پروفیسر ٹائن بی کے نظریہ "چیلنج اور اس کے جواب" کی علمی حیثیت کیا ہے، اِس سے ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں، لیکن اس کی ایک افادیت بہرحال اپنی جگہ مسلّم ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح زلزلے کے اثرات سے کسی عمارت کی پختگی کا اندازہ لگایا جاتا ہے بالکل اسی طرح مصائب اور اُن سے نبرد آزما ہونے کے عزم ہی سے کسی قوم کی خفتہ قوتوں اور اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پھر جس طرح عمارت کے استحکام کا اندازہ ہم اس کے در و بام اس کی آرائش و تزئین سے نہیں لگاتے بلکہ اُس محکم بنیاد کو نگاہ میں رکھتے ہیں جس نے اسے زلزلے کے شدید جھٹکوں سے بچایا، بالکل اسی طرح ہم قوموں کے حفظ و بقا میں بھی یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے ہاں کتنے سینما ہال ہیں، کتنی رقص گاہیں ہیں، اور ان میں کتنی رونق ہوتی ہے، اور میخانے کس قدر آباد ہیں، بلکہ اُس غیر مرئی طاقت اور قوت کا کھوج لگایا جاتا ہے جس کے سہارے پر یہ قوم بڑی پامردی کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہ جائزہ بڑا دلچسپ ہے اور اس سے تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں بعض نہایت مفید ابواب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس وقت ہمیں دوسری قوموں سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں ہم پاکستان کی اس اصل قوت کا ماخذ و منبع معلوم کرنا چاہتے ہیں جس کے بل پر اس نے حالیہ جنگ کے زلزلے کا مقابلہ بڑی مضبوطی کے ساتھ کیا ہے۔

بھارت نے جن حالات میں ہم پر حملہ کیا ہے اُن میں مادی اعتبار سے ہم جس قدر مضبوط

ہیں اس کا اندازہ ہم سب کو ہے ۔ہم پر اچانک ایک ایسی قوم ٹوٹ پڑی جو تعداد اسلحہ اور دیگر ساز و سامان کے لحاظ سے ہم سے کم از کم پانچ گنی زیادہ طاقتور تھی۔ تعداد میں زیادتی اور وسائل کی فراوانی کی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی قومیں، امریکہ، روس اور برطانیہ اس کی ہر طرح پشت پناہی کر رہی تھیں۔ ایک فعّال سیاسی جماعت نے جس کی بہر حال اپنی ایک تاریخ ہے۔ اسے رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد مہیا کر رکھی ہے۔ سائنس، فلسفہ، ادب، معیشت اور معاشرت، غرض ہر شعبۂ زندگی میں ہندوستان کے پاس نہایت اچھے دماغ موجود ہیں۔ الغرض جہاں تک جارحی قوم کے اعضاء کا تعلق ہے انہیں کسی صورت بھی کمزور نہیں کہا جا سکتا۔

اگر ان سب پہلوؤں کو نگاہ میں رکھ کر اہل پاکستان کا جائزہ لیا جائے تو حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نظر نہیں آتی۔ ہمارے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہے۔ ہمارا نہ رقبہ یک جا ہے نہ آبادی مجتمع۔ پھر اس ملک کے مختلف خطوں کے رہنے والوں میں نہ تو رنگ کا اشتراک ہے، نہ نسل اور زبان کا۔ ہم گزشتہ ۱۸ برس سے مسلسل اخلاقی انحطاط کا شکار ہو رہے تھے اور اب تو حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہماری آبادیوں میں جرائم کی کثرت کے باعث کوئی شخص اپنی جان و مال اور آبرو کو بھی محفوظ نہ پاتا تھا۔ آرٹ اور کلچر کے نام سے یہاں فحاشی کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ سیاسی گروہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے اور مذہبی طبقوں کی باہمی رقابتوں نے مذہب کا وقار گرا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں اہلِ علم، اہلِ فکر اور اہلِ فن کی بھی اتنی نمایاں تعداد نہ پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ہماری قوم دنیا میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارے اندر کوئی ایسی معتمد اور جامع صفات شخصیت بھی نہ تھی جس کی آواز صورِ اسرافیل کی حیثیت رکھتی اور پوری قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتی۔ ایثار، باہمی ہمدردی، جذبۂ تعاون یہ صفات آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں اور ان کی جگہ چالاکی، عیّاری، خود غرضی کا تسلّط قائم ہو رہا تھا۔

یہ سارے حالات کسی قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے والے نہ تھے بلکہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے تھے۔ چنانچہ ہماری قوم پر بڑی سرعت سے اضمحلال طاری ہو رہا تھا کہ یکایک بھارت کا حملہ ہونے کے ساتھ ہی اُس کے اندر زندگی کی بالکل ایک نئی لہر دوڑ گئی، افتراق کی جگہ اتحاد پیدا ہوا۔ مختلف طبقوں کی منافرت چشم زدن میں ختم ہو گئی۔ ہر گروہ نے دوسرے کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ خود غرضی کی جگہ ہر مقام پر ایثار اور ہمدردی کے نمونے نظر آنے لگے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری کی بجائے مردانگی، عزم اور جفاکشی کی صفات اُبھر کر سامنے آگئیں۔ آبرو باختہ اور بدکردار لوگوں نے اپنی سابقہ روش بدل کر عوام کی عزت و آبرو کی حفاظت شروع کر دی اور جرائم سے ہاتھ روک لیے۔ اور تاجروں نے جن کی خود غرضانہ ذہنیت نے محنت کشوں اور عام آبادی کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا یکایک اپنے رویّہ میں تبدیلی پیدا کی اور اس موقع کو ناجائز منافعوں کے حصول کا ذریعہ بنانے کی بجائے اس میں غیر معمولی ایثار کا ثبوت دیا۔ فوج کے ایک ایک فرد نے جس عالی ہمتی، جس بے مثال شجاعت، جس صبر و ثبات، جس ضبط و نظم اور جس بلند کردار کا مظاہرہ کیا ہے اس کی نظیر دورِ جدید میں ملنی بہت مشکل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ایک نیم بر اعظم کے رہنے والے، جنہیں ایک دوسرے سے الگ ہوئے بمشکل اٹھارہ سال ہوئے ہیں اُن کے درمیان فکر و نظر اور جذبہ و احساس کا یہ عظیم اختلاف کیوں رونما ہوا۔ اگر محض جنگ نے مسلم قوم کے اندر یہ خصوصیات پیدا کی ہیں تو پھر بھارت کے رہنے والوں کو بھی اسی طرزِ عمل کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ مگر واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تعمیری صلاحیتیں اُبھرنے کی بجائے منفی رجحانات نے زور پکڑنا شروع کیا۔ اگر محض جنگ ہی قوم کی تعمیر کر سکتی تو آج تک دنیا کی کوئی قوم بھی برباد نہ ہونے پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ ایک آزمائش یا چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بنا پر یہ قوم کی دبی ہوئی اور خفتہ قوتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہے مگر کسی تعمیری قوت کو از خود جنم نہیں دے

سکتی۔ جنگ کی آگ میں جھونکے جانے کے بعد وہی قومیں کندن بنتی ہیں جن میں صلاحیت پہلے سے موجود ہو۔ ورنہ تعمیری قوتوں سے محروم اقوام کو تو جنگ بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

پھر ان قوتوں کے متعلق بھی یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ اُسی صورت میں اُبھر کر سامنے آتی ہیں جب کوئی زبردست محرک ان کے اندر تحریک پیدا کرے۔ اخبارات میں بھارتی فوج کے بارے میں اسی کے ایک میجر جنرل نرنجن پرشاد کے جو تاثرات مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں وہ اس حقیقت پر پوری طرح شاہد ہیں کہ اُس کی بزدلی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اُس کے سامنے کوئی ایسا واضح نصب العین نہ تھا جس کا عشق اُسے جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرتا۔ کرائے کے سپاہی پیٹ کے لالچ میں پاکستان کے مقابلے میں اُتر آئے تھے لیکن وہ حیران و ششدر تھے کہ آخر زندگی جیسی قیمتی متاع کو وہ کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کے لیے نچھاور کریں۔ محض دشمن پر فتح حاصل کرنا تو کوئی بلند نصب العین نہیں۔ یہ تو ایک منفی ہیجان ہے جس سے مغلوب ہو کر غیر مہذب لوگ کمزوروں پر پل پڑتے ہیں لیکن ہر ہیجان کی طرح یہ کسی فرد یا قوم کو زیادہ دیر تک ایک روش پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ یہی حال بھارت کا ہے۔ اُس نے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے محض اپنی قوت و طاقت کی نمائش اور پاکستان کو مرعوب کرنے کی غرض سے اس خطۂ پاک پر یلغار کی لیکن جب آگے سے اہلِ پاکستان نے مزاحمت کی تو نشہ فوراً ہی ہرن ہو گیا۔ اور مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ جب تک کسی واضح نصب العین کی روشنی کسی قوم کی راہ کو منور نہ کرے اس وقت تک اس قوم کیلیے کسی ایک روش پر مصائب و آلام میں گھرے رہنے کے باوجود لمبی مدت تک قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے اس حقیقت کا صرف نرنجن پرشاد نے ہی اعتراف نہیں کیا بلکہ دنیا کے بڑے بڑے غیر مسلم اخبارات نے بھی اس صداقت کو تسلیم کیا ہے۔ لندن آبزرور کی جو رپورٹ سامنے آئی ہے اُس میں اس حقیقت کی طرف بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی کی گئی ہے کہ "پاکستانی فوج کی کامیابی کا سب سے بڑا اور اصل راز اس کا واضح نصب العین ہے"۔

پاکستان کی افواج اور اس کے باشندوں نے اس خطۂ ارضی کی حفاظت میں جس فدائیت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے اُسے دیکھ کر کبھی ایک لمحہ کے لیے باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں دنیاوی غرض کا کوئی شائبہ بھی موجود تھا۔ اس ملک کے ایک ایک فرد نے جس بے لوث کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس حقیقت کا پوری طرح آئینہ دار ہے کہ اُس کی تہ میں کوئی بڑا پاکیزہ اور مقدس جذبہ کام کر رہا ہے اور کسی بڑے ہی اعلیٰ وارفع مقصد کی غیر معمولی محبت نے ہمارے اندر عزم و استقلال اور پاکیزہ احساسات پیدا کیے۔ یہ مقصد بجز اسلام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت آج پوری طرح نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ مسلمانوں کی قوت کا اتھاہ اور لازوال خزانہ صرف اسلام ہی ہے۔ دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے۔ اس ملک میں مسلمانوں نے جب کبھی کوئی جد وجہد کی تو اس کا محرک صرف اسلام تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے مجدد الف ثانی نے قلعہ گوالیار میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ اسی کی سربلندی کے لیے بالاکوٹ میں نفوسِ قدسی اور سعید روحوں نے جانیں دیں۔ یہی نصب العین مختلف اوقات میں مختلف تحریکات کی صورت میں نمودار ہوا۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ دیوبند، تحریکِ ندوہ اور خود تحریکِ پاکستان اسی بنیادی مقصد یعنی احیائے اسلام کے مختلف مظاہر ہیں۔ اور اب بھارت کے حملے کا اہلِ پاکستان نے جس پامردی اور جن نیک اور پاکیزہ عزائم کے ساتھ مقابلہ کیا ہے، وہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس قوم کو اگر کوئی چیز دنیا میں عزت و احترام کے ساتھ زندہ رکھ سکتی ہے تو محض اسلام ہے۔ اس کے علاوہ جتنے دوسرے سہارے ہیں اُن کی حیثیت پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں ہم پر جو احسانات کیے ہیں وہ شمار سے باہر ہیں۔ یُوں محسُوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس خطّہ کو اسلام کے احیاء کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ دنیا ہم پر تنگ ہو گئی تھی۔ باری تعالیٰ نے ہمیں وسعت و کشائش کی راہ دکھائی۔ ہم دشمن کے مقابلے میں کمزور اور ناتواں تھے۔ اس نے ہمیں اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے قوت و توانائی بخشی۔

ہم جن قوموں پر تکیہ لگا کر خداوند تعالیٰ کی تائید و نصرت سے غافل ہو رہے تھے انہوں نے عین وقت پر ہمیں دھوکا دیا اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم دنیا میں بالکل تنہا اور بے سہارا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت میں ہماری معاونت اور دستگیری فرمائی جنگ کے بعض واقعات کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس مالک الملک نے فرشتوں کو ہماری مدد کے لیے بھیجا۔ اگر ہم امریکہ، برطانیہ اور روس کی تائید سے محروم ہو گئے تھے تو ہماری حمایت پر بعض دوسری قوموں کو کھڑا کر دیا۔ دنیا کے سارے مسلم ممالک میں اخوتِ اسلامی کے جذبہ کو اُبھارا اور وہاں کے عوام اور خواص نے نہ صرف ہمارے موقف کی اخلاقی تائید کی بلکہ پُورے جوش اور ولولے کے ساتھ ہماری طرف دستِ تعاون بڑھایا اور ہمارے دوش بدوش کھڑے ہو کر کفر کی یلغار روکنے کے لیے پیش کش کی۔

دنیا میں ہم سے زیادہ بدبخت اور بدنصیب کون ہو گا اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ان نوازشات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس سے مُنہ موڑنے کی حماقت کریں۔ یہ وقت باری تعالیٰ کی نافرمانی کا نہیں بلکہ اُس کی احسانمندی اور شکر گزاری کا ہے۔

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑا سا چارہ ملنے پر بھی تر و تازگی پُوری ہو، اور دُودھ زیادہ دے۔ اسی سے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پُوری قدر کرے۔ باری تعالیٰ نے واقعی ہماری حقیر کوششوں کو شرف پذیرائی بخشا۔ اس بنا پر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم اُس کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اُس کے ساتھ مضبوط رشتۂ عبودیت استوار کریں۔ کیونکہ ہم اُس کی شکر گزاری میں جتنا آگے بڑھیں گے اتنا ہی وہ ہم پر انعام و اکرام کی مزید بارش فرمائے گا۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ	اگر شکر گزار ہو گے تو مَیں تم کو اور زیادہ دُوں گا
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ	اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا

(ابراہیم - آیت ۷) بہت سخت ہے۔

قرآن مجید میں مختلف اقوام کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو پہلی مرتبہ سرکشی کرنے پر ہی اپنی گرفت میں نہیں لے لیا بلکہ اس کی رحمت نے دنیا کی ہر قوم کو بار بار سنبھلنے کا موقع دیا کہ وہ نافرمانی کی روش چھوڑ کر حق و صداقت کی راہ اختیار کرے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی۔ اُن کی رہنمائی کے لیے بڑے جلیل القدر انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ انہیں دنیاوی ذرائع و وسائل سے مالا مال کیا اور دُنیا میں اُن کے آرام کے لیے مختلف سامان مہیا کیے۔ پھر انہیں اقوام عالم میں عزت و برتری دی لیکن بدعہدی اس قوم کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ جب مصائب کا ریلا آتا، یہ قوم کانپ اٹھتی۔ اللہ کی طرف رجوع کرتی اور اس کے ساتھ اطاعت و فرمانبرداری کا عہد و پیمان باندھتی۔ لیکن مصائب کے چنگل سے رہا ہوتے ہی سب کچھ بھلا دیتی اور بغاوت اور سرکشی کی اُسی راہ پر گامزن ہو جاتی جس پر مصائب کے امڈنے سے پہلے چل رہی تھی۔

بنی اسرائیل مصر کے جابر اور ظالم فرمانرواؤں کے تحت جس طرح ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اُن کی نجات کا سامان پیدا کیا۔ مگر اس قوم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور ہر قدم پر بڑی ناپسندیدہ روش اختیار کی۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ لیکن انہیں دیکھنے کے باوجود بہت کم لوگ ایمان لاتے۔ پھر مالک الملک نے عین اُن کی آنکھوں کے سامنے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے والے گروہ کو معجزانہ طور پر بحر قلزم پار کرا دیا۔ لیکن اس قوم کی ذہنی کجی کا یہ عالم تھا کہ بیابان شور سے گزرتے ہوئے جب اس نے سینا کے بُت کدوں میں پرستارانِ صنم کو بتوں کی پوجا میں مشغول دیکھا تو کہنے لگی "موسیٰ! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم بھی اسی طرح اُن کی پرستش کریں"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

قوم کی زبان سے جب یہ مشرکانہ مطالبہ سُنا تو بہت رنجیدہ ہوئے اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پرستش پر مائل ہو اور خدا کی اُن تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے ہو جن کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو"

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (صف آیت ۵)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا! اے قوم تو کس لیے مجھے ایذا پہنچاتی ہے جبکہ تجھے معلوم ہے کہ میں تیری جانب اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ پھر جب وہ کجی پر اڑے رہے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں پر کجی کو مسلط کر دیا اور اللہ نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔

اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے کے بعد راہِ حق سے انحراف کرنا بہت بڑی ضلالت اور گمراہی ہے اور مصیبت کے ٹل جانے کے بعد اس سے مُنہ پھیر لینا پرلے درجے کی احسان فراموشی اور ناشکری ہے۔ یہ ایک نہایت خوفناک قسم کے نفسیاتی مرض کی علامات ہیں۔ اس مرض میں مبتلا ہونے والا حقیقت پسند نہیں بلکہ حقیقت ناشناس ہوتا ہے۔ وہ واضح اور روشن دلائل کو قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ میں نخوت اور تکبر کے جراثیم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے اندر کسی نیکی کو راہ پانے کا موقع نہیں دے سکتا۔ اس کا مغرورانہ احساس اُس کے جذبہ سپاس گزاری کو مضمحل کر دیتا ہے اور وہ اس حد تک بے حس اور غافل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا بھی اعتراف نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب باری تعالیٰ نے ہر شعبۂ زندگی کے متعلق واضح احکام تختیوں پر لکھ کر دے دیئے تو پھر اُن سے کہا:

سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ۔ عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔

عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ ۔

(الاعراف - آیات ۱۴۵-۱۴۶)

میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے۔ اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اس سے غفلت برتتے رہے۔

اللہ کا عذاب صرف بنی اسرائیل پر ہی نازل نہ ہوا بلکہ دنیا کی ہر وہ قوم اس کی گرفت میں آئی جس نے مالک الملک کی دی ہوئی مہلتوں سے اپنے غرورِ نفس کی بنا پر فائدہ نہ اٹھایا۔ قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور اسی طرح کی دوسری بے شمار قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں میں ہمیں بھی ایک سبق ملتا ہے کہ انہیں صفحۂ ہستی سے اس بنا پر مٹا دیا گیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بار بار بدعہدی کا ارتکاب کیا۔ جب مصیبت آئی تو اس کے حضور میں گڑگڑانے لگے اور عذاب سے نجات دلانے کی التجائیں کرنے لگے۔ لیکن عذاب ٹلتے ہی اُسی روش پر گامزن ہو گئے جو فساق، فجار اور ایمان سے عاری لوگوں کی روش ہوتی ہے۔ نقضِ عہد معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی ایک سنگین بُرائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں کسی شخص پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جائے۔ لیکن جب خدا کا بندہ اپنے خالق و مالک ہی سے بدعہدی کرنے لگے تو اس سے بڑے جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک شرمناک مذاق ہے کہ بار بار اُس سے وعدہ کرے اور اس کی بے مثال فیاضی، تحمل اور بُردباری اور اس کی

بے پایاں رحمت سے فائدہ اٹھا کر پھر اس سے منہ موڑے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے ہی قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ بدنصیب قوم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس لیے محروم ہو گئی کہ اُسے اپنے عہد کا کوئی پاس نہ تھا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً۔ (المائدہ-۱۳)

پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔

پاس عہد کی صحیح صورت ایک ہی ہے کہ عبودیت کے اُن تقاضوں کو پُورا کرنے کی کوشش کی جائے جو ایک بندے پر اس کے مالک کی طرف سے عائد ہوتے ہیں اور یہ فرض اکراہ اور بد دلی کے ساتھ نہیں بلکہ پُوری خوشدلی اور جذبۂ سپاس گزاری کے ساتھ ادا کیا جائے عبودیت اور شکر گزاری دونوں لازم ملزوم ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا صحیح معنوں میں بندہ ہو وہ کبھی ناشکر گزار نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر مرحلہ پر اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع کرے گا۔ ہر مصیبت میں اسی سے اعانت کا طلبگار ہو گا اور باری تعالیٰ جب اُسے اپنی رحمت سے نوازے گا تو پھر وہ اُس سے غافل ہونے کی بجائے اُس کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرے گا۔ مالک الملک کی احسان فراموشی کا تو کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تو کافروں اور خدا کے باغیوں کا شیوہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کی طرف مختلف انداز میں تصریح کی گئی ہے۔

وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ۔ (الزمر-۷)

اللہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا ہے اور وہ تمہاری شکر گزاری کی روش کو تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔

پھر اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا

جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ

رَبَّهٗ مُنِيبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۔ (الزمر - ۸)	اپنے رب کی طرف متوجہ ہوکر اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اللہ اُس کو نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس سے بچانے کے لیے وہ پہلے اس کو پکار رہا تھا، اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ اس کی راہ سے لوگوں کو بھٹکا دے۔ اے نبی، اس سے کہدو کہ اپنے کفر کا مزہ کچھ دن اور اٹھالے۔ تو دوزخیوں میں سے ہونے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اور ایمان میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یہ ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہوتی ہے اور اپنے خالق پر اُس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شکر گزاری ایمان کی شہادت ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ قرآن مجید نے اس کی یوں صراحت فرمائی ہے:

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۔ (الزمر - ۶۶)	بلکہ اللہ کی بندگی کرو اور شکر گزاروں میں سے ہو۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ ہم پاکستان کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا کس طرح شکر ادا کریں جو اس نے ہم پر ہماری ساری غفلتوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود کی ہیں۔ شکر گزاری تین طریقوں ہی سے کی جاسکتی ہے۔ دل سے، زبان سے، اور عمل سے۔ دل سے باری تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم پوری یکسوئی کے ساتھ اُس کی طرف رجوع کریں، اُس کی رضا کو دنیا کی ہر چیز پر مقدم رکھیں، اُسی کو اپنا حقیقی منعم سمجھیں، اُسی کی ذات سے ہمتا پر ہر حال میں

بھروسہ کریں اور جان بوجھ کر اس کی نافرمانی کا ارادہ نہ کریں۔ یہ کیفیت ہمارے اندر اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہمارے دل میں اللہ پر سچّا اور پختہ ایمان موجود ہو۔ اور یہ ایمان دینی طرزِ فکر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے ملک کے اندر اس طرزِ فکر کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس وقت جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ اس طرزِ فکر کو تقویت پہنچانے کی بجائے اُسے مضمحل کرنے والا ہے۔ آج اگر لوگوں میں اس نظامِ تعلیم و تربیت سے "فیض یاب" ہونے کے باوجود ایمان کا نور باقی ہے تو یہ اس نظام کا عطیہ نہیں ہے بلکہ زیادہ تر یہ ہماری صدیوں کی قومی روایات کے غیر شعوری اثرات کا نتیجہ ہے، اور ایک اچھی خاصی تعداد ہمارے اندر ایسے لوگوں کی بھی موجود ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ ابراہیمی پر پیدا کیا ہے کہ باطل افکار و نظریات کی آگ میں پوری طرح جھونک دیئے جانے کے باوجود ان کے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ ورنہ ہماری نوخیز نسلوں کو درسگاہوں میں جو سائنس اور فلسفہ پڑھایا جاتا ہے وہ تو اُن سارے معتقدات کی عین ضد ہے جو امّت کا سرمایۂ حیات ہیں، جن کی بدولت اِس امت نے ہر مرحلہ پر مصائب اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور جن کے معجزانہ اثرات ہم اس جنگ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ آخر سوچیے کہ وہ کونسا سہارا تھا جس کے بل بوتے پر آج قوم کھڑی ہو گئی؟ وہ کونسا جذبہ تھا جس نے قوم کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑایا؟ وہ کونسا پارس تھا جس نے مسِ خام کو دفعتاً کندن بنا کر رکھ دیا؟ آپ اس سوال پر جتنا غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارے اندر زندگی کی جو غیر معمولی حرکت پیدا ہوئی ہے، ہمارے دلوں میں جو مقدس ولولے بیدار ہوئے ہیں وہ سب انہی معتقدات کا فیضان ہے جن کا اس جدید تعلیم کے علی الرغم بچا کھچا سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ نظامِ تعلیم ہمارے دینی طرزِ فکر کو نشو و نما دینے کے بجائے محض مغربی قوموں کی بھونڈی نقالی میں صرف ہو رہی ہے، اور یہ نظامِ تربیت ہمیں اسلامی نصب العین سے قریب تر کرنے کے بجائے اُس سے بڑی سرعت کے ساتھ دُور لے جا رہا ہے۔ آج ہمارے فکر و عمل میں جو بگاڑ نظر آتا ہے وہ سب اسی غیر ملکی نظامِ تعلیم کا

نتیجہ ہے۔ یہ تو محض خداوند تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُس نے اسلام کے لیے ان حوصلہ شکن حالات میں بھی ہمارے دل و دماغ سے اس کی برتری کا نقش قائم رکھا اور اس نعمتِ غیر مترقبہ سے ہمیں محروم نہیں فرمایا۔ ورنہ جس قسم کے فکری اور نظریاتی ماحول میں اور جس قسم کی اسلام کش فضا میں ہماری اولاد تعلیم حاصل کر رہی ہے، اس میں اسلام سے عقیدت اور وابستگی کا موجود ہونا کسی طرح بھی معجزہ سے کم نہیں۔

اس جنگ کے حالات کو دیکھ کر اگر کوئی بنیادی سبق ہم حاصل کر سکتے ہیں تو صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم قوم کو ذہنی انتشار سے نجات دلائیں اور ان معتقدات کی پرورش کا سامان کریں جن پر اس قوم کے حفظ و بقا اور توسیع و ترقی کا سارا دارومدار ہے۔ اس ضمن میں ہمیں سب سے زیادہ اپنے نظامِ تعلیم میں اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انگریزی کی برتری ختم کر کے اس کی جگہ اردو اور عربی کو رواج دیا جائے۔ نصاب کی اس طرح تدوین کی جائے کہ اُس میں خدا اور آخرت اور وحی کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونے کی بجائے اس کا یقین پیدا ہو۔ سائنس خالقِ کائنات کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرے۔ فلسفہ ذہن سے تشکیک کے سارے کانٹے چن کر اُس میں اسلامی عقائد کی آبیاری کرے۔ علم المعیشت وہ اصول دے جن سے اسلامی احکام و ہدایات کے مطابق معاشرے میں ایک پاکیزہ معاشی نظام معرضِ وجود میں آئے۔ علمِ سیاست دین و دنیا کی ثنویت کے غیر اسلامی تصور کا ابطال کر کے دین کی اساس پر مملکت کے قیام میں امت کی رہنمائی کرے۔ علم الاخلاق مغرب کی اخلاقی اقدار کی برتری ثابت کرنے کے بجائے اسلام کی پیش کردہ اقدارِ حیات کا شارح و ترجمان ہو اور ان کی صحت پر واضح دلائل فراہم کرے۔ الغرض غیر اسلامی طرزِ فکر کی ترویج و اشاعت کی جگہ خالص خدا پرستانہ طرزِ فکر پروان چڑھے اور ہماری نئی نسلیں دینی افکار و نظریات کی علمبردار بن کر دنیا میں اپنا مقام پیدا کریں۔

طرزِ فکر یا عقائد کے بعد دوسری چیز جو ہماری توجہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے وہ اسلامی اخلاق ہے۔ یہ اسی اخلاق کا بچا کچا سرمایہ تھا جو ان پر آشوب حالات میں ہمارے کام آیا۔ اگر ہمارے پاس یہ سرمایہ نہ ہوتا تو ہم کبھی بھی دشمن کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکتے۔ اسی اخلاق کی بدولت ہمارے تاجروں کے اندر لوٹ کھسوٹ کا ناپاک جذبہ پیدا ہونے کے بجائے ایثار اور ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا مگر انہوں نے محض جذبۂ جہاد کی بنا پر ایسا کرنا معیوب سمجھا اور ایک ایسی روش اختیار کی جس کا اسلامی اخلاق مقتضی تھا۔ اسی طرح اگر معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر اپنی سابقہ روش پر قائم رہتے ہوئے اپنی سماج دشمن حرکات سے باز نہ آتے تو گھروں سے اجڑنے والی آبادیوں کا جو حشر ہوتا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کیا اور اس بنا پر یہ لوگ مظلوموں کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنانے کے بجائے ان کی معاونت اور دستگیری کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ اسی سلسلہ میں اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اگر بھارت کا حملہ ہوتے ہی ہر شخص اپنی عافیت کی فکر میں لگ جاتا تو پھر دوسروں کی عافیت کی کیونکر فکر کرتا۔ اگر بزدلی کی وجہ سے قوم میں بھگدڑ مچ جاتی تو اس حالت میں ہمارے پاؤں کہاں جم سکتے تھے۔ آزمائش کے اس دور میں اسلام نے جو ہمیں اخلاق دیئے تھے وہی آخر کار ہمارے کام آئے۔ ہماری افواج نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود بڑی پامردی کا ثبوت دیا۔ ہماری آبادیوں نے زندگی اور موت، نفع اور نقصان خدا کے اختیار میں سمجھتے ہوئے غیر معمولی ہمت اور استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے تاجروں نے قومی مصالح کو منافع پر ترجیح دی اور خدا کی محبت پر دولت کی محبت کو قربان کر دیا یہاں تک کہ ہماری قوم کے بدنام لوگوں نے بھی محض خداترسی کی وجہ سے بُرائی سے ہاتھ روک لیے۔ ہم کو اس وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ جس نظامِ اخلاق نے ان پُرآشوب حالات میں ہماری دستگیری کی ہے کیا ہم گزشتہ ۱۸ برس سے اُس کے استحکام کی فکر میں لگے ہوئے تھے یا اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں منہمک رہے۔ یہی بات

یہ ہے کہ ہم نے اسلامی اخلاق کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ درسگاہوں میں ادب، آرٹ اور کلچر کے نام پر اس کی بیخ کنی کی پوری کوششیں کی گئیں۔ معاشرے میں ثقافت کے نام پر ہر اُس برائی کو پھیلایا گیا جو اس اخلاق میں انتہائی معیوب اور فتنہ انگیز تصوّر کی جاتی ہے۔ مخلوط تعلیم کی وجہ سے مرد و زن کا اختلاط بڑھا اور اسلام نے حسن و نظر کے درمیان جو پردے حائل کر رکھے ہیں وہ چاک ہوئے۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج سے خاندانی نظام کی بنیادیں تنزلزل کرنے کے سامان ہوئے۔ خاندانی نظام کا دار و مدار میاں اور بیوی دونوں کی پاکبازی، اولاد سے محبت اور خدا خوفی پر ہے۔ مگر خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی ہے اُس کے پیہم تجربات سے دنیا بھر میں یہ حقیقت پُوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ جس جس قوم کے اندر بھی یہ مقبول ہوئی اس میں لوگوں نے خاندانی ذمہ داریوں سے بچ کر آزاد شہوت رانی کی غیر اخلاقی راہ اختیار کی۔ یہ تجربات مختلف ممالک میں ماضی اور حال ہر عہد میں ہو چکے ہیں اور ان کا یہی نتیجہ ہر مقام اور ہر دَور میں برآمد ہوا ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اخلاق کو مضبوط کر کے خاندانی نظام کو مستحکم بنانا چاہتے ہیں یا عوام کو سرکاری خرچ سے منع حمل اور اسقاطِ حمل کے گر سکھا کر انہیں عیاشی اور فحاشی کی راہ پر ڈالنے کے آرزومند ہیں؟

یہ وہ وقت ہے جس میں ہمیں اُن ساری بُرائیوں کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیے جن سے ہمارے اخلاق بگڑنے کا ذرا سا بھی اندیشہ ہو۔ اس معاملے میں معمولی غفلت بھی اپنی بربادی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس بنا پر یہ چیز اشد ضروری ہے کہ ثقافت کے نام پر جو کاروبار یہاں ہو رہا ہے اُسے فی الفور لپیٹا جائے۔ مخلوط تعلیم کا خاتمہ کیا جائے۔ ریڈیو اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع کو قوم کے اخلاق بگاڑنے کے بجائے انہیں سنوارنے کے لیے پوری طرح استعمال کیا جائے۔ سول سروس کے انتخاب میں قابلیت اور استعداد کو نگاہ میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق کو بھی نگاہ میں رکھا جائے اور جو اس معیار پر پُورے نہ اُترتے

(باقی صفحے پر)

تفہیم القرآن

الاحقاف

(۳)

تمہارے گرد وپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں ہم نے اپنی آیات بھیجکر بار بار طرح طرح سے اُن کو سمجھایا، شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا[۳۲]؟ بلکہ وہ تو اُن سے کھوئے گئے، اور یہ تھا اُن کے جھوٹ اور اُن بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔

(اور وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں[۳۳]۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں

۳۲۔ یعنی اُن ہستیوں کے ساتھ عقیدت کی ابتدا تو انہوں نے اس خیال سے کی تھی کہ یہ خدا کے مقبول بندے ہیں۔ اِن کے وسیلے سے خدا کے ہاں ہماری رسائی ہوگی۔ مگر بڑھتے بڑھتے انہوں نے خود انہی ہستیوں کو معبود بنا لیا، انہی کو مدد کے لیے پکارنے لگے، انہی سے دعائیں مانگنے لگے، اور انہی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحب تصرف ہیں، ہماری فریاد رسی و مشکل کشائی یہی کریں گے۔ اِس گمراہی سے ان کو نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے ان جھوٹے خداؤں کی بندگی پر اڑے رہے اور اصرار کیے چلے گئے کہ ہم اللہ کے بجائے انہی کا دامن تھامے رہیں گے۔ اب بتاؤ، ان مشرک قوموں پر جب ان کی گمراہی کی وجہ سے اللہ کا عذاب آیا تو اُن کے وہ فریاد رس اور مشکل کشا معبود کہاں مر رہے تھے؟ کیوں نہ اس بُرے وقت میں وہ ان کی دستگیری

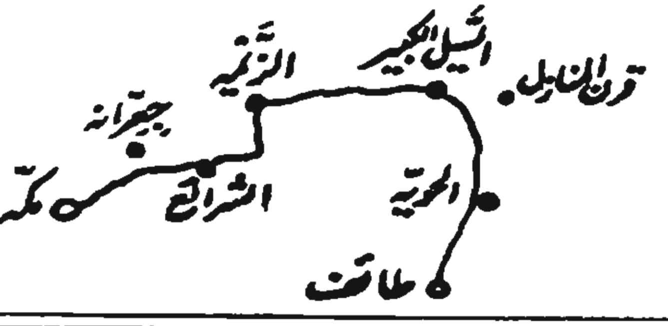
کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا "اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے

کو آئے ؟

۳۳ اس آیت کی تفسیر میں جو روایات حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زُبیر، حضرت عبداللہ بن عباس، اور حضرات حسن بصری، سعید بن جُبیر، زرّ بن حُبَیش، مجاہد، عکرمہ اور دوسرے بزرگوں سے منقول ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جنوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ، جس کا اس آیت میں ذکر ہے، بطنِ نَخلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابنِ اسحٰق، ابو نُعیم اصفہانی اور واقدی کا بیان ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مایوس ہو کر مکّہ معظمہ کی طرف واپس ہوئے تھے۔ راستہ میں آپ نے نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں عشا یا فجر یا تہجد کی نماز میں آپ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا، اور وہ آپ کی قراءت سننے کے لیے ٹھیر گیا۔ اس کے ساتھ تمام روایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس موقع پر جن حضور کے سامنے نہیں آئے تھے نہ آپ نے ان کی آمد کو محسوس فرمایا تھا بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے آپ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

یہ مقام جہاں یہ واقعہ پیش آیا، یا تو الزَّیمہ تھا، یا السَّیل الکبیر، کیونکہ یہ دونوں مقام وادی نَخلہ میں واقع ہیں، دونوں جگہ پانی اور سرسبزی موجود ہے اور طائف سے آنے والوں کو اگر اس وادی میں پڑاؤ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ انہی دونوں میں سے کسی جگہ ٹھیر سکتے ہیں۔

نقشے میں ان مقامات کا موقع ملاحظہ ہو: اوطاس



حق اور راہِ راست کی طرف ۳۴۔ اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذابِ الیم سے بچا دے گا ۳۵۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا

۳۴۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جن پہلے سے حضرت موسیٰ اور کتبِ آسمانی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء دیتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے وہ اس کتاب، اور اس کے لانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے۔

۳۵۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد جنوں کے پے در پے وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے لگے اور آپ سے اُن کی رُو در رُو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارے میں جو روایات کتبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکّہ معظمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔

اِن میں سے ایک وفد کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں رات بھر غائب رہے۔ ہم لوگ سخت پریشان تھے کہ کہیں آپؐ پر کوئی حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔ صبح سویرے ہم نے آپ کو حِراء کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ پُوچھنے پر آپؐ نے بتایا کہ ایک جن مجھے بلانے آیا تھا، مَیں نے اس کے ساتھ آکر یہاں جنوں کے ایک گروہ کو قرآن سنایا (مسلم، مُسند احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکّہ میں حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جنوں کی ملاقات کے لیے چلتا ہے؟ مَیں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مکّہ کے بالائی حصّہ میں ایک جگہ حضورؐ نے لکیر کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ مَیں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنہوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے اور وہ میرے اور آپ کے درمیان حائل ہیں (ابنِ جریر، بیہقی، دلائل النبوۃ۔ اَبونُعیم اصفہانی، دلائل النبوۃ)

رکھتا ہے کہ اللہ کو زِچ کر دے، اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور کیا اِن لوگوں کو یہ سُجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے ہوئے جو نہ تھکا، وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو جِلا اٹھائے۔ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اُس وقت اِن سے پوچھا جائے گا "کیا یہ حق نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں، ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)۔" اللہ فرمائے گا "اچھا تو اب عذاب کا مزا چکھو اپنے اُس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔"

پس اے نبی، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو[۴۲]۔ جس روز یہ لوگ اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا اِنہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو اِنہیں یُوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟ ع

ایک اور موقع پر بھی رات کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور مکہ معظمہ میں حَجُون کے مقام پر جِنوں کے ایک مقدمہ کا آپ نے فیصلہ فرمایا۔ اس کے سالہا سال بعد ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں جاٹوں کے ایک گروہ کو دیکھ کر کہا حَجُون کے مقام پر جِنوں کے جس گروہ کو میں نے دیکھا تھا وہ اِن لوگوں سے بہت مشابہ تھا (ابن جریر)

[۴۱] ہو سکتا ہے کہ یہ فقرہ بھی جِنوں ہی کے قول کا حصہ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اُن کے قول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ ہو۔ فحوائے کلام سے دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس محسوس ہوتی ہے۔

[۴۲] یعنی جس طرح تمہارے پیش رو انبیاء اپنی قوم کی بے رُخی، مخالفت، مزاحمت اور طرح طرح کی ایذا رسانیوں کا مقابلہ سالہا سال تک مسلسل صبر اور ان تھک جدوجہد کے ساتھ کرتے رہے اسی طرح تم بھی کرو، اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ یا تو یہ لوگ جلدی سے ایمان لے آئیں، یا پھر اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دے

تفہیم القرآن

محمدؐ

نام | آیت نمبر ۲ کے فقرے وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ سے ماخوذ ہے یعنی وہ سورۃ جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آیا ہے۔ اِس کے علاوہ اس کا ایک اور مشہور نام "قتال" بھی ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مضامین یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہے جب جنگ کا حکم نازل ہو چکا تھا، مگر ابھی جنگ عملاً شروع نہ ہوئی تھی۔ اس کے مفصل دلائل آگے حاشیہ ۸ میں ملیں گے۔

تاریخی پس منظر | جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اُس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں خاص طور پر اور عرب کی سرزمین میں بالعموم ہر جگہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر مدینۂ طیبہ کے دارالامان میں جمع ہو گئے تھے، مگر کفارِ قریش یہاں بھی ان کو چین سے بیٹھنے دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی ہر طرف سے کفار کے نرغے میں گھری ہوئی تھی اور وہ اسے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اس حالت میں دو ہی چارۂ کار باقی رہ گئے تھے، یا تو وہ دینِ حق کی دعوت و تبلیغ ہی سے نہیں بلکہ اس کی پیروی تک سے دست بردار ہو کر جاہلیت کے آگے سپر ڈال دیں، یا پھر مرنے مارنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور سردھڑ کی بازی لگا کر ہمیشہ کے لیے اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ عرب کی سرزمین میں

اسلام کو رہنا ہے یا جاہلیت کو۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو اُسی عزیمت کی راہ دکھائی جو اہلِ ایمان کے لیے ایک ہی راہ ہے۔ اُس نے پہلے سورۂ حج (آیت ۳۹) میں ان کو جنگ کی اجازت دی، اور پھر سورۂ بقرہ (آیت-۱۹۰) میں اس کا حکم دے دیا۔ مگر اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ اِن حالات میں جنگ کے معنی کیا ہیں۔ مدینے میں اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جمعیت تھی جو پورے ایک ہزار مردانِ جنگی بھی فراہم کرنے کے قابل نہ تھی، اور اس سے کہا جا رہا تھا کہ سارے عرب کی جاہلیت سے ٹکرا جانے کے لیے تلوار لے کر کھڑی ہو جائے۔ پھر لڑائی کے لیے جس سر و سامان کی ضرورت تھی وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی ایک ایسی بستی مشکل ہی سے فراہم کر سکتی تھی جس کے اندر سینکڑوں بے خانماں مہاجر ابھی پوری طرح بسے بھی نہ تھے اور چاروں طرف سے اہلِ عرب نے معاشی مقاطعہ کر کے اُس کی کمر توڑ رکھی تھی۔

موضوع اور مضمون | یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل فرمائی گئی۔ اس کا موضوع اہلِ ایمان کو جنگ کے لیے تیار کرنا اور ان کو اِس سلسلہ میں ابتدائی ہدایات دینا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ قتال بھی رکھا گیا ہے۔ اس میں ترتیب وار حسبِ ذیل مضامین ارشاد ہوتے ہیں:

آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اِس وقت دو گروہوں کے درمیان مقابلہ درپیش ہے۔ ایک گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ حق کو ماننے سے انکار کر چکا ہے اور اللہ کے راستہ میں سدِّ راہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور دوسرے گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ اُس حق کو مان گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کا دوٹوک فیصلہ یہ ہے کہ پہلے گروہ کی تمام سعی و عمل کو اس نے رائیگاں کر دیا، اور دوسرے گروہ کے حالات درست کر دیئے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ابتدائی جنگی ہدایات دی گئی ہیں۔ ان کو اللہ کی مدد

اور رہنمائی کا یقین دلایا گیا ہے۔ ان کو اللہ کی راہ میں قربانیاں کرنے پر بہترین اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ اور انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ راہِ حق میں ان کی کوششیں رائیگاں نہ جائیں گی بلکہ دنیا سے لیکر آخرت تک وہ ان کا اچھے سے اچھا پھل پائیں گے۔

پھر کفار کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی تائید و رہنمائی سے محروم ہیں۔ ان کی کوئی تدبیر اہل ایمان کے مقابلے میں کارگر نہ ہوگی اور وہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہت بُرا انجام دیکھیں گے۔ انہوں نے اللہ کے نبی کو مکّہ سے نکال کر یہ سمجھا کہ انہیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے، حالانکہ دراصل یہ کام کرکے انہوں نے اپنی تباہی کو خود اپنے اوپر دعوت دے دی۔

اس کے بعد منافقین کی طرف روئے سخن پھرتا ہے جو جنگ کا حکم آنے سے پہلے تو بڑے مسلمان بنے پھرتے تھے، مگر یہ حکم آجانے کے بعد ان کے ہوش اڑ گئے تھے اور وہ اپنی عافیت کی فکر میں کفار سے ساز باز کرنے لگے تھے تاکہ اپنے آپ کو جنگ کے خطرات سے بچالیں۔ ان کو صاف صاف خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کے معاملہ میں منافقت اختیار کرنے والوں کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ یہاں تو بنیادی چیز یہ ہے کہ آدمی حق کے ساتھ ہے یا باطل کے ساتھ۔ اس کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہیں یا کفر اور کفار کے ساتھ۔ وہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کو عزیز رکھتا ہے یا اُس حق کو جس پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ اِس آزمائش میں جو شخص کھوٹا نکلتا ہے وہ مومن ہی نہیں ہے، کجا کہ اس کی نماز اور اس کا روزہ اور اس کی زکوٰۃ خدا کے ہاں کسی اجر کی مستحق ہو۔

پھر مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور اُن کے سروسامان کی فراوانی دیکھ کر ہمت نہ ہاریں، اُن کے آگے صلح

کی پیش کش کرکے کمزوری کا اظہار نہ کریں جس سے اُن کی جرأتیں اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اور زیادہ بڑھ جائیں، بلکہ اللہ کے بھروسے پر اٹھیں اور کفر کے اس پہاڑ سے ٹکرا جائیں۔ اللہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ وہی غالب رہیں گے۔ اور یہ پہاڑ ان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

آخر میں مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی ہے۔ اگرچہ اُس وقت مسلمانوں کی معاشی حالت بہت پتلی تھی، مگر سامنے مسئلہ یہ درپیش تھا کہ عرب میں اسلام اور مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے کی اہمیت و نزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے دین کو کفر کے غلبہ سے بچانے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنی جانیں بھی لڑائیں اور جنگی تیاری میں اپنے مالی وسائل بھی پوری امکانی حد تک کھپا دیں۔ اس لیے مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اس وقت جو شخص بھی بخل سے کام لیگا وہ دراصل اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا بلکہ خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے خطرے میں ڈال لے گا۔ اللہ تو انسانوں کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے دین کی خاطر قربانیاں کرنے سے ایک گروہ اگر جی چرائے گا تو اللہ اسے ہٹا کر دوسرا گروہ اس کی جگہ لے آئے گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

جن لوگوں نے کفر کیا[۱] اور اللہ کے راستے سے روکا[۲]، اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں

---

[۱] یعنی اُس تعلیم و ہدایت کو ماننے سے انکار کر دیا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے تھے۔

[۲] اصل میں صَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ صَدّ عربی زبان میں لازم اور متعدی، دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اِن الفاظ کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خود اللہ کے راستے پر آنے سے باز رہے، اور یہ بھی کہ انہوں نے دوسروں کو اس راہ پر آنے سے روکا۔ دوسروں کو خدا کی راہ سے روکنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اِس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی

کر دیا ۳ ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اُس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل

زبردستی کسی کو ایمان لانے سے روک دے ۔ دوسری صورت یہ کہ وہ ایمان لانے والوں پر ایسا ظلم و ستم ڈھائے کہ اُن کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور دوسروں کے لیے ایسے خوفناک حالات میں ایمان لانا مشکل ہو جائے ۔ تیسری صورت یہ کہ وہ مختلف طریقوں سے دین اور اہلِ دین کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ایسے وسوسے دلوں میں ڈالے جس سے لوگ اِس دین سے بدگمان ہو جائیں ۔ اس کے علاوہ ہر کافر اس معنی میں خدا کی راہ سے روکنے والا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کفر کے طریقے پر پرورش کرتا ہے اور پھر اس کی آئندہ نسل کے لیے دینِ آبائی کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ اِسی طرح ہر کافر معاشرہ خدا کے راستے میں ایک سنگِ گراں ہے ، کیونکہ وہ اپنی تعلیم و تربیت سے ، اپنے اجتماعی نظام اور رسم و رواج سے ، اور اپنے تعصبات سے دینِ حق کے پھیلنے میں شدید رکاوٹیں ڈالتا ہے ۔

۳ ۔ اصل الفاظ ہیں اَضَلَّ اعمالھم ۔ یہ الفاظ بڑے وسیع مفہوم کے حامل ہیں ۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ توفیق سلب کر لی کہ ان کی کوششیں اور محنتیں صحیح راستے میں صرف ہوں ۔ اب وہ جو کچھ بھی کریں گے غلط مقاصد کے لیے غلط طریقوں ہی سے کریں گے اور ان کی تمام سعی و جہد ہدایت کے بجائے ضلالت ہی کی راہ میں صرف ہو گی ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کام اپنے نزدیک وہ خیر کے کام سمجھ کر کرتے رہے ہیں ، مثلاً خانۂ کعبہ کی نگہبانی ، حاجیوں کی خدمت ، مہمانوں کی ضیافت ، رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی ، اور ایسے ہی دوسرے کام جنہیں عرب میں مذہبی خدمات اور مکارمِ اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا ، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ضائع کر دیا ۔ اُن کا کوئی اجر و ثواب ان کو نہ ملے گا ، کیونکہ جب وہ اللہ کی توحید اور صرف اُسی کی عبادت کا طریقہ اختیار کرنے سے انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اِس راہ پر آنے سے روکتے ہیں تو ان کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا ۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ راہِ حق کو روکنے اور اپنے کافرانہ مذہب کو عرب میں زندہ رکھنے کے لیے جو کوششیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کر رہے ہیں ، اللہ نے ان کو

ہوئی ہے ۔۔۔ جو سراسر حق ہے ان کے رب کی طرف سے ۔۔۔ اللہ نے ان کی برائیاں اُن سے دُور کر دیں۵ اور ان کا حال درست کر دیا۶۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے اُس حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔

رائیگاں کر دیا۔ ان کی ساری تدبیریں اب محض ایک تیر بے ہدف ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے مقصد کو ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔

۴؎ اگرچہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہنے کے بعد اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ایمان لانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر نازل ہونے والی تعلیمات پر ایمان لانا آپ سے آپ شامل ہے۔ لیکن اس کا الگ ذکر خاص طور پر یہ جتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہو جانے کے بعد کسی شخص کا خدا اور آخرت اور پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کو ماننا بھی اُس وقت تک نافع نہیں ہے جب تک کہ وہ آپؐ کو اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ مان لے۔ یہ تصریح اس لیے ضروری تھی کہ ہجرت کے بعد اب مدینۂ طیبہ میں اُن لوگوں سے بھی سابقہ درپیش تھا جو ایمان کے دوسرے تمام لوازم کو تو مانتے تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے۔

۵؎ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جاہلیت کے زمانے میں جو گناہ ان سے سرزد ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب ان کے حساب سے ساقط کر دیئے۔ اب اُن پر کوئی بازپرس ان سے نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ عقائد اور خیالات اور اخلاق اور اعمال کی جن خرابیوں میں وہ مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ اُن سے دور کر دیں۔ اُن کے ذہن بدل گئے۔ اُن کے عقائد اور خیالات بدل گئے۔ ان کی عادتیں اور خصلتیں بدل گئیں۔ ان کی سیرتیں اور ان کے کردار بدل گئے۔ اب اُن کے اندر جاہلیت کی جگہ ایمان ہے اور بدکرداریوں کی جگہ عملِ صالح۔

۶؎ اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ پچھلی حالت کو بدل کر آئندہ کے لیے اللہ

کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اُس کے پورے سیاق و سباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اُس اُمت کے لیے دین تھی اور اُس کے دورِ نبوت میں اُسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت ہے، اس لیے امتِ محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دور کے لیے دین ہے اور اُس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا، اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اِسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے اُنہی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا، اور اب اقامتِ دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق انہیں ادا کیا جائے۔ انہی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور

خوف کے مارے مدینے کے منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کا حال یہ ہو رہا تھا کہ جیسے اُن پر موت چھا گئی ہو۔ اِس کے علاوہ سورۂ انفال کی آیات ۶۷-۶۹ بھی اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ آیت جنگِ بدر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ:

"کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے۔"

اس عبارت اور خصوصاً اس کے خط کشیدہ فقروں پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس موقع پر عتاب جس بات پر ہوا تھا وہ یہ تھی کہ جنگِ بدر میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل دینے سے پہلے مسلمان دشمن کے آدمیوں کو قید کرنے میں لگ گئے تھے، حالانکہ جنگ سے پہلے جو ہدایت سورۂ محمدؐ میں ان کو دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ "جب تم اُن کو اچھی طرح کچل دو تو پھر قیدیوں کو مضبوط باندھو۔" تاہم، چونکہ سورۂ محمدؐ میں مسلمانوں کو قیدیوں سے فدیہ لینے کی اجازت دی جا چکی تھی اس لیے جنگِ بدر کے قیدیوں سے جو مال لیا گیا اسے اللہ نے حلال قرار دیا اور مسلمانوں کو اس کے لینے پر سزا نہ دی۔ "اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا" کے الفاظ اس امر کی طرف صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے فدیہ لینے کی اجازت کا فرمان قرآن میں آ چکا تھا، اور قرآن کے اندر سورۂ محمدؐ کی اِس آیت کے سوا کوئی دوسری آیت ایسی نہیں ہے جس میں یہ فرمان پایا جاتا ہو، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ آیت سورۂ انفال کی مذکورۂ بالا آیت سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۱۵۹-۱۶۱۔

یہ قرآن مجید کی پہلی آیت ہے جس میں قوانینِ جنگ کے متعلق ابتدائی ہدایات دی گئی ہیں۔ اِس سے جو احکام نکلتے ہیں، اور اس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے جس طرح عمل

کیا ہے، اور فقہاء نے اس آیت اور سنّت سے جو استنباطات کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جنگ میں مسلمانوں کی فوج کا اصل ہدف دشمن کی جنگی طاقت کو توڑ دینا ہے، یہاں تک کہ اس میں لڑنے کی سکت نہ رہے اور جنگ ختم ہو جائے۔ اس ہدف سے توجہ ہٹا کر دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کرنے میں نہ لگ جانا چاہیے۔ قیدی پکڑنے کی طرف توجہ اُس وقت کرنی چاہیے جب دشمن کا اچھی طرح قلع قمع کر دیا جائے اور میدان جنگ میں اس کے کچھ آدمی باقی رہ جائیں۔ اہل عرب کو یہ ہدایت آغاز ہی میں اس لیے دے دی گئی کہ وہ کہیں فدیہ حاصل کرنے، یا غلام فراہم کرنے کے لالچ میں پڑ کر جنگ کے اصل ہدفِ مقصود کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔

(۲) جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ تمہیں اختیار ہے، خواہ ان پر احسان کرو، یا ان سے فدیہ کا معاملہ کر لو۔ اِس سے عام قانون یہ نکلتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حسن بصری، عطاء اور حمّاد بن ابی سلیمان، قانون کے اِسی عموم کو لیتے ہیں، اور یہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو قتل لڑائی کی حالت میں کیا جا سکتا ہے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی اور قیدی ہمارے قبضے میں آگیا تو اسے قتل کرنا درست نہیں ہے۔ ابن جریر اور ابوبکر جصّاص کی روایت ہے کہ حجّاج بن یوسف نے جنگی قیدیوں میں سے ایک قیدی کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالہ کیا اور حکم دیا کہ اسے قتل کر دیں۔ انہوں نے انکار کر دیا اور یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ ہمیں قید کی حالت میں کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ امام محمد نے السِّیَر الکبیر میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ایک جنگی قیدی کے قتل کا حکم دیا تھا اور انہوں نے اسی بنا پر اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا۔

(۳) مگر چونکہ اس آیت میں قتل کی صاف ممانعت بھی نہیں کی گئی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا منشا یہ سمجھا اور اسی پر عمل بھی فرمایا کہ اگر کوئی خاص وجہ ایسی ہو جس کی بنا پر اسلامی حکومت کا فرمانروا کسی قیدی یا بعض قیدیوں کو قتل کرنا ضروری سمجھے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ یہ عام قاعدہ نہیں ہے بلکہ قاعدۂ عام میں ایک استثناء ہے جسے بضرورت

ہی استعمال کیا جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے ، قیدیوں میں سے صرف عُقبہ بن ابی مُعیط اور نَضر بن الحارث کو قتل کیا۔ جنگ اُحُد کے قیدیوں میں سے صرف ابوعزہ شاعر کو قتل فرمایا۔ بنی قُریظہ نے چونکہ اپنے آپ کو حضرت سعد بن مُعاذ کے فیصلے پر حوالے کیا تھا اور ان کے اپنے تسلیم کردہ حَکَم کا فیصلہ یہ تھا کہ ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، اس لیے آپ نے ان کو قتل کرا دیا۔ جنگ خیبر میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سے صرف کِنانہ ابن ابی الحُقَیق قتل کیا گیا کیونکہ اس نے بدعہدی کی تھی۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے تمام اہلِ مکہ میں سے صرف چند خاص اشخاص کے متعلق حکم دیا کہ ان میں سے جو بھی پکڑا جائے وہ قتل کر دیا جائے۔ اِن مستثنیات کے سوا حضورؐ کا عام طریقہ اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا کبھی نہیں رہا۔ اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی تھا۔ ان کے زمانے میں بھی قتلِ اسیرانِ جنگ کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں اور ہر مثال میں قتل کسی خاص وجہ سے کیا گیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اپنے پورے زمانۂ خلافت میں صرف ایک جنگی قیدی کو قتل کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ اسی بنا پر جمہور فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی حکومت اگر ضرورت سمجھے تو اسیر کو قتل کر سکتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے۔ ہر فوجی اس کا مجاز نہیں ہے کہ جس قیدی کو چاہے قتل کر دے۔ البتہ اگر قیدی کے فرار ہونے کا یا اُس سے کسی خطرناک شرارت کا اندیشہ ہو جائے تو جس شخص کو بھی اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے وہ اسے قتل کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے اسلام نے تین تصریحات اور بھی کی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر قیدی اسلام قبول کر لے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قیدی صرف اُسی وقت تک قتل کیا جا سکتا ہے جب تک وہ حکومت کی تحویل میں ہو۔ تقسیم یا بیع کے ذریعہ سے اگر وہ کسی شخص کی مِلک میں جا چکا ہو تو پھر اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرے یہ کہ قیدی کو قتل کرنا ہو تو بس سیدھی طرح قتل کر دیا جائے، عذاب دے دے کر نہ مارا جائے۔

دہم، جنگی قیدیوں کے بارے میں عام حکم جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یا اُن پر احسان کرو، یا

فِدیے کا معاملہ کرلو۔

احسان میں چار چیزیں شامل ہیں: ایک یہ کہ قید کی حالت میں اُن سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قتل یا دائمی قید کے بجائے ان کو غلام بنا کر افرادِ مسلمین کے حوالہ کردیا جائے۔ تیسرے یہ کہ جزیہ لگا کر ان کو ذمّی بنا لیا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کو بلامعاوضہ رہا کردیا جائے۔

فدیے کا معاملہ کرنے کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ مالی معاوضہ لے کر انہیں چھوڑا جائے۔ دوسرے یہ کہ رہائی کی شرط کے طور پر کوئی خاص خدمت لینے کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اپنے اُن آدمیوں سے جو دشمن کے قبضے میں ہوں، اُن کا تبادلہ کرلیا جائے۔

ان سب مختلف صورتوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام نے مختلف اوقات میں حسبِ موقع عمل فرمایا ہے۔ خدا کی شریعت نے اسلامی حکومت کو کسی ایک ہی شکل کا پابند نہیں کردیا ہے۔ حکومت جس وقت جس طریقے کو مناسب ترین پائے اُس پر عمل کرسکتی ہے۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ ایک جنگی قیدی جب تک حکومت کی قید میں رہے، اُس کی غذا اور لباس، اور اگر وہ بیمار یا زخمی ہو تو اس کا علاج، حکومت کے ذمہ ہے۔ قیدیوں کو بھوکا ننگا رکھنے، یا ان کو عذاب دینے کا کوئی جواز اسلامی شریعت میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حسنِ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت بھی کی گئی ہے، اور عملاً بھی اسی کی نظیریں سُنّت میں ملتی ہیں۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف صحابہ کے گھروں میں بانٹ دیا اور ہدایت فرمائی کہ استوصوا بالاساریٰ خیراً، "اِن قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا"۔ اُن میں سے ایک قیدی، ابوعزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے گھر میں رکھا گیا تھا وہ صبح شام مجھ کو روٹی کھلاتے تھے اور خود صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔ ایک اور قیدی سُہیل بن عَمْرو کے متعلق حضور سے کہا گیا کہ یہ بڑا آتش بیان مقرر ہے، آپ کے خلاف تقریریں کرتا رہا ہے، اِس کے دانت تڑوا دیجیے۔ حضور نے جواب دیا "اگر میں اس کے دانت تڑواؤں تو اللہ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں" (سیرت ابن ہشام)۔ یمامہ کے

سردار ثمامہ بن اُثال جب گرفتار ہوکر آئے تو جب تک وہ قید میں رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمدہ کھانا اور دودھ ان کے لیے مہیا کیا جاتا رہا (ابن ہشام)۔ یہی طرز عمل صحابہ کرام کے دور میں بھی رہا۔ جنگی قیدیوں سے بُرے سلوک کی کوئی نظیر اُس دور میں نہیں ملتی۔

(۶) قیدیوں کے معاملے میں یہ شکل اسلام نے سرے سے اپنے ہاں رکھی ہی نہیں ہے کہ ان کو ہمیشہ قید رکھا جاتے اور حکومت اُن سے جبری محنت لیتی رہے۔ اگر اُن کے ساتھ تبادلے یا فدیے کا کوئی معاملہ نہ ہو تو اُن کے معاملے میں احسان کا طریقہ یہ رکھا گیا ہے کہ انہیں غلام بنا کر افراد کی ملکیت میں دے دیا جائے اور اُن کے مالکوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی اس طریقے پر عمل کیا گیا ہے، صحابۂ کرام کے عہد میں بھی یہ جاری رہا ہے، اور فقہائے اسلام بالاتفاق اِس کے جواز کے قائل ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ جو شخص قید میں آنے سے پہلے اسلام قبول کر چکا ہو اور پھر کسی طرح گرفتار ہو جائے وہ تو آزاد کر دیا جائے گا، مگر جو شخص قید ہونے کے بعد اسلام قبول کرے، یا کسی شخص کی ملکیت میں دے دیئے جانے کے بعد مسلمان ہو تو یہ اسلام اس کے لیے آزادی کا سبب نہیں بن سکتا۔ مُسند احمد، مسلم، اور ترمذی میں حضرت عمران بن حُصَین کی روایت ہے کہ بنی عُقَیل کا ایک شخص گرفتار ہوکر آیا اور اُس نے کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو قلتھا وانت تملک امرک افلحت کل الفلاح "اگر یہ بات تونے آزاد ہونے کی حالت میں کہی ہوتی تو یقیناً فلاح پا جاتا"۔ یہی بات حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے کہ اذا اسلم الاسیر فی ایدی المسلمین فقد امن من القتل وھو رقیق "جب قیدی مسلمانوں کے قبضے میں آنے کے بعد مسلمان ہو تو وہ قتل سے تو محفوظ ہو جائے گا مگر غلام رہے گا"۔ اسی بنا پر فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قید ہونے کے بعد مسلمان ہونے والا غلامی سے نہیں بچ سکتا (السیر الکبیر، امام محمد)۔ اور یہ بات سراسر معقول بھی ہے۔ اگر ہمارا قانون یہ ہوتا کہ جو شخص بھی گرفتار ہونے کے بعد اسلام قبول کرلے گا وہ آزاد کر دیا جائے گا

تو آخر وہ کونسا نادان قیدی ہوتا جو کلمہ پڑھ کر رہائی نہ حاصل کر لیتا۔

(۷) قیدیوں کے ساتھ احسان کی تیسری صورت اسلام میں یہ رکھی گئی ہے کہ جزیہ لگا کر ان کو دارالاسلام کی ذمّی رعایا بنا لیا جائے اور وہ اسلامی مملکت میں اُسی طرح آزاد ہو کر رہیں جس طرح مسلمان رہتے ہیں۔ امام محمد السیر الکبیر میں لکھتے ہیں کہ "ہر وہ شخص جس کو غلام بنانا جائز ہے اُس پر جزیہ لگا کر اُسے ذمّی بنا لینا بھی جائز ہے"۔ اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں "مسلمانوں کے فرمانروا کو یہ حق ہے کہ اُن پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر خراج لگا کر انہیں اصلاً آزاد قرار دے دے"۔ اس طریقے پر بالعموم اُن حالات میں عمل کیا گیا ہے جبکہ قید ہونے والے لوگ جس علاقے کے باشندے ہوں وہ مفتوح ہو کر اسلامی مملکت میں شامل ہو چکا ہو۔ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اہلِ خیبر کے معاملہ میں یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا، اور پھر حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق اور دوسرے علاقوں کی فتح کے بعد بڑے پیمانے پر اس کی پیروی کی۔ ابوعُبید نے کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ عراق کی فتح کے بعد اُس علاقے کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین، پہلے اہلِ ایران ہم پر مسلط تھے۔ انہوں نے ہم کو بہت ستایا، بُرا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا اور طرح طرح کی زیادتیاں ہم پر کرتے رہے۔ پھر جب خدا نے آپ لوگوں کو بھیجا تو ہم آپ کی آمد سے بڑے خوش ہوئے اور آپ کے مقابلے میں نہ کوئی مدافعت ہم نے کی نہ جنگ میں کوئی حصّہ لیا۔ اب ہم نے سنا ہے کہ آپ ہمیں غلام بنا لینا چاہتے ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "تم کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جاؤ، یا جزیہ قبول کر کے آزاد رہو"۔ ان لوگوں نے جزیہ قبول کر لیا اور وہ آزاد چھوڑ دیئے گئے۔ ایک اور جگہ اسی کتاب میں ابو عُبید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو لکھا کہ "جنگ میں جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان میں سے ہر کاشت کار اور کسان کو چھوڑ دو"۔

(۸) احسان کی چوتھی صورت یہ ہے کہ قیدی کو بلا کسی فدیے اور معاوضے کے یونہی رہا کر دیا جائے۔ یہ ایک خاص رعایت ہے جو اسلامی حکومت صرف اُسی حالت میں کر سکتی ہے جبکہ کسی خاص قیدی کے حالات اس کے متقاضی ہوں، یا توقع ہو کہ یہ رعایت اُس قیدی کو ہمیشہ کے لیے ممنونِ احسان

کر دے گی اور وہ دشمن سے دوست یا کافر سے مومن بن جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دشمن قوم کے کسی شخص کو اس لیے چھوڑ دینا کہ وہ پھر ہم سے لڑنے آجائے کسی طرح بھی تقاضائے مصلحت نہیں ہو سکتا اسی لیے فقہائے اسلام نے بالعموم اس کی مخالفت کی ہے، اور اس کے جواز کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ "اگر امام مسلمین قیدیوں کو، یا ان میں سے بعض کو بطور احسان چھوڑ دینے میں مصلحت پائے تو ایسا کرنے میں مضائقہ نہیں ہے" (السیر الکبیر)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اِس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں اور قریب قریب سب میں مصلحت کا پہلو نمایاں ہے۔

جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق آپ نے فرمایا لوکان المطعم بن عديّ حيًّا ثم كلمنى فی ھولاء النتنی لتركتهم له (بخاری، ابوداود، مُسندِ احمد)۔ "اگر مُطعِم بن عدِی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے اِن گھناؤنے لوگوں کے بارے میں بات کرتا تو میں اس کی خاطر انہیں یونہی چھوڑ دیتا"۔ یہ بات حضورؐ نے اِس لیے فرمائی تھی کہ آپ جب طائف سے مکّہ معظمہ واپس ہوئے تھے اس وقت مُطعِم ہی نے آپ کو اپنی پناہ میں لیا تھا اور اُس کے لڑکے ہتھیار باندھ کر اپنی حفاظت میں آپ کو حرم میں لے گئے تھے۔ اس لیے آپ اُس کے احسان کا بدلہ اِس طرح اُتارنا چاہتے تھے۔

بخاری، مُسلم، اور مُسندِ احمد کی روایت ہے کہ یَمامہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضورؐ نے ان سے پوچھا "ثُمامہ، تمہارا کیا خیال ہے؟" انہوں نے کہا "اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کا خون کچھ قیمت رکھتا ہے، اگر مجھ پر احسان کریں گے تو ایسے شخص پر کریں گے جو احسان ماننے والا ہے، اور اگر آپ مال لینا چاہتے ہیں تو مانگیے، آپ کو دیا جائے گا"۔ تین دن تک آپ ان سے یہی بات پوچھتے رہے اور وہ یہی جواب دیتے رہے۔ آخر کو آپ نے حکم دیا کہ ثُمامہ کو چھوڑ دو۔ رہائی پاتے ہی وہ قریب کے ایک نخلستان میں گئے، نہا دھو کر واپس آئے، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے اور عرض کیا کہ "آج سے پہلے کوئی شخص میرے لیے آپ سے اور کوئی دین آپ کے دین سے بڑھ کر مبغوض نہ تھا، مگر اب کوئی شخص اور کوئی دین مجھے آپ سے اور آپ کے دین سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے"۔ پھر وہ عُمرہ کے لیے مکّے گئے اور وہاں قریش کے لوگوں کو

نوٹس دے دیا کہ آج کے بعد کوئی غلہ تمہیں یمامہ سے نہ پہنچے گا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مکہ والوں کو حضورؐ سے التجا کرنی پڑی کہ یمامہ سے ہمارے غلہ کی رسد بند نہ کرائیں۔

بنی قُرَیظہ کے قیدیوں میں سے آپؐ نے زَبیر بن باطا اور عمرو بن سعد (یا ابن سُعدی) کی جاں بخشی کی۔ زبیر کو اس لیے چھوڑا کہ اس نے جاہلیت کے زمانے میں جنگ بُعاث کے موقع پر حضرت ثابت بن قیس انصاری کو پناہ دی تھی، اس لیے آپ نے اس کو حضرت ثابت کے حوالہ کر دیا تاکہ اس کے احسان کا بدلہ ادا کر دیں۔ اور عمرو بن سعد کو اس لیے چھوڑا کہ جب بنی قُرَیظہ حضور کے ساتھ بدعہدی کر رہے تھے اُس وقت یہی شخص اپنے قبیلے کو غداری سے منع کر رہا تھا (کتاب الاموال لابی عُبَید)

غزوہ بنی المُصطَلِق کے بعد جب اس قبیلے کے قیدی لائے گئے اور لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے، اس وقت حضرت جُوَیرِیہ جس شخص کے حصے میں آئی تھیں اُس کو اُن کا معاوضہ ادا کر کے آپ نے انہیں رہا کرایا اور پھر اُن سے خود نکاح کر لیا۔ اس پر تمام مسلمانوں نے یہ کہہ کر اپنے اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا کہ یہ" اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہو چکے ہیں۔ اس طرح سَو خاندانوں کے آدمی رہا ہو گئے (مُسنَد احمد۔ طبقات ابن سعد۔ سیرت ابن ہشام)۔

صلح حُدَیبیہ کے موقع پر مکہ کے ۸۰ آدمی تنعیم کی طرف سے آئے اور فجر کی نماز کے قریب انہوں نے آپ کے کیمپ پر اچانک شبخون مارنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے اور حضور نے سب کو چھوڑ دیا تاکہ اس نازک موقع پر یہ معاملہ لڑائی کا موجب نہ بن جائے (مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، مُسنَد احمد)

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے چند آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے تمام اہلِ مکہ کو بطور احسان معاف کر دیا، اور جنہیں مستثنیٰ کیا تھا اُن میں سے بھی تین چار کے سوا کوئی قتل نہ کیا گیا۔ سارا عرب اس بات کو جانتا تھا کہ اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کیے تھے۔ اس کے مقابلہ میں فتح پا کر جس عالی حوصلگی کے ساتھ حضورؐ نے ان لوگوں کو معاف فرمایا اس سے اہلِ عرب کو یہ اطمینان

حاصل ہو گیا کہ ان کا سابقہ کسی جبّار سے نہیں بلکہ ایک نہایت رحیم و شفیق اور فیاض رہنما سے ہے۔ اسی بنا پر فتحِ مکہ کے بعد پورے جزیرۃ العرب کو مسخر ہونے میں دو سال سے زیادہ دیر نہ لگی۔

جنگِ حُنین کے بعد جب قبیلۂ ہوازن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے حاضر ہوا تو سارے قیدی تقسیم کیے جا چکے تھے۔ حضورؐ نے سب مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا یہ لوگ تائب ہو کر آئے ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ ان کے قیدی ان کو واپس دے دیئے جائیں۔ تم میں سے جو کوئی بخوشی اپنے حصے میں آئے ہوئے قیدی کو بلا معاوضہ چھوڑنا چاہے وہ اس طرح چھوڑ دے، اور جو معاوضہ لینا چاہے اس کو ہم بیت المال میں آنے والی پہلی آمدنی سے معاوضہ دے دینگے۔ چنانچہ چھ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے اور جن لوگوں نے معاوضہ لینا چاہا انہیں حکومت کی طرف سے معاوضہ دے دیا گیا۔ (بخاری، ابوداؤد، مسند احمد، طبقات ابن سعد)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم ہو چکنے کے بعد حکومت قیدیوں کو خود رہا کر دینے کی مجاز نہیں رہتی، بلکہ یہ کام اُن لوگوں کی رضامندی سے، یا ان کو معاوضہ دے کر کیا جا سکتا ہے جن کی ملکیت میں قیدی دیئے جا چکے ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام کے دَور میں بھی بطورِ احسان قیدیوں کو رہا کرنے کی نظیریں مسلسل ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اَشعث بن قیس کِندی کو رہا کیا، اور حضرت عمرؓ نے ہُرمزان کو اور مَنَاذِر اور مَیسان کے قیدیوں کو آزادی عطا کی (کتاب الاموال لابی عُبید)۔

(۹) مالی معاوضہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صرف جنگِ بدر کے موقع پر ملتی ہے جبکہ فی قیدی ایک ہزار سے ۴ ہزار تک کی رقمیں لے کر ان کو رہا کیا گیا (طبقات ابن سعد۔ کتاب الاموال)۔ صحابۂ کرام کے دَور میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور فقہائے اسلام نے بالعموم اس کو ناپسند کیا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم روپیہ لے کر دشمن کے ایک آدمی کو چھوڑ دیں تاکہ وہ پھر ہمارے خلاف تلوار اٹھائے۔ لیکن چونکہ قرآن میں فدیہ لینے کی اجازت دی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس پر عمل بھی کیا ہے، اس لیے ایسا کرنا مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔ امام محمد السیر الکبیر میں کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو اس کی ضرورت پیش

آ ئے تو وہ مالی معاوضہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔

(۱۰) کوئی خدمت لیکر چھوڑنے کی مثال بھی جنگ بدر کے موقع پر ملتی ہے۔ قریش کے قیدیوں میں سے جو لوگ مالی فدیہ دینے کے قابل نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے حضورؐ نے یہ شرط عائد کر دی کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ (مُسندِ احمد، طبقات ابن سعد، کتاب الاموال)

(۱۱) قیدیوں کے تبادلے کی متعدد مثالیں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک مہم پر بھیجا اور اس میں چند قیدی گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک نہایت خوبصورت عورت بھی تھی جو حضرت سَلَمہ بن اَکْوَع کے حصے میں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باصرار اس کو حضرت سَلَمہ سے مانگ لیا اور پھر اسے مکہ بھیج کر اس کے بدلے کئی مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا (مسلم۔ ابوداؤد طحاوی۔ کتاب الاموال لابی عبید۔ طبقات ابن سعد) حضرت عِمران بن حُصَین کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلۂ ثقیف نے مسلمانوں کے دو آدمیوں کو قید کر لیا۔ اس کے کچھ مدت بعد ثقیف کے حلیف قبیلے، بنی عُقَیل کا ایک آدمی مسلمانوں کے پاس گرفتار ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کو طائف بھیج کر اس کے بدلے ان دونوں مسلمانوں کو رہا کرا لیا۔ (مسلم، ترمذی، مُسندِ احمد)۔ فقہاء میں سے امام ابویوسف، امام محمد، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد تبادلۂ اسیران کو جائز رکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا ایک قول یہ ہے کہ تبادلہ نہیں کرنا چاہیے، مگر دوسرا قول ان کا بھی یہی ہے کہ تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ جو قیدی مسلمان ہو جائے اسے تبادلہ میں کفّار کے حوالہ نہ کیا جائے۔

اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں ایک ایسا وسیع ضابطہ بنایا ہے جس کے اندر ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات میں اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی گنجائش ہے۔ جو لوگ قرآن مجید کی اس آیت کا بس یہ مختصر سا مطلب لے لیتے ہیں کہ جنگ میں قید ہونے والوں کو "یا تو بطور احسان چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے"، وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ جنگی قیدیوں کا معاملہ کتنے مختلف پہلو رکھتا ہے، اور مختلف زمانوں میں وہ کتنے مسائل پیدا کرتا رہا ہے اور آئندہ کر سکتا ہے۔

مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتدا اور اس کے اسباب

ابوالاعلیٰ مودودی

خلافتِ راشدہ کا زوال جن حالات میں اور جن اسباب سے ہوا ان کے نتائج میں سے ایک اہم نتیجہ یہ بھی تھا کہ اُمتِ مسلمہ کے اندر مذہبی اختلافات رُونما ہو گئے۔ پھر ان اختلافات کو جس چیز نے جمنے اور مستقل فرقوں کی بنیاد بننے کا موقع دے دیا وہ بھی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ نظامِ خلافت اپنی اصلی شکل پر قائم نہ رہا تھا، کیونکہ ملوکیت کے نظام میں کوئی ایسا با اختیار اور معتمد علیہ ادارہ موجود نہ تھا جو اختلافات کے پیدا ہو جانے کی صورت میں ان کو بروقت صحیح طریقے سے حل کر دیتا۔

ابتداً اس فتنے کی بھی بظاہر کچھ بہت زیادہ خطرناک نہ تھی۔ صرف ایک شورش تھی جو بعض سیاسی اور انتظامی شکایات کی بنا پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ان کے آخری دور میں اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پُشت پر نہ کوئی نظریہ اور فلسفہ تھا، نہ کوئی مذہبی عقیدہ۔ مگر جب اس کے نتیجے میں آنجناب کی شہادت واقع ہوگئی، اور حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں نزاعات کے طوفان نے ایک زبردست خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی، اور جنگِ جمل، جنگِ صفین، قضیۂ تحکیم اور جنگ نہروان کے واقعات پے در پے پیش آتے چلے گئے، تو ذہنوں میں یہ سوالات اُبھرنے اور جگہ جگہ موضوعِ بحث بننے لگے کہ ان لڑائیوں میں حق پر کون ہے اور کیوں ہے؟ باطل پر کون ہے اور اس کے برسرِ باطل ہونے کے وجوہ کیا ہیں؟ کسی کے نزدیک اگر فریقین باطل پر یا حق پر ہیں تو وہ کس بنا پر یہ رائے رکھتا ہے؟ اور کوئی اگر فریقین کے معاملہ میں سکوت یا غیر جانبداری اختیار کرتا ہے تو اس کے پاس اپنی اِس روش کے لیے کیا دلیل ہے؟ ان

سوالات کے نتیجے میں چند قطعی اور واضح نظریات پیدا ہوئے جو اپنی اصل کے لحاظ سے خالص سیاسی تھے، مگر بعد میں ہر نظریے کے حامی گروہ کو بتدریج اپنا موقف مضبوط کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ دینیاتی بنیادیں فراہم کرنی پڑیں اور اس طرح یہ سیاسی فرقے رفتہ رفتہ مذہبی فرقوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔

پھر جو کشت وخون اختلافات کے آغاز میں ہوا اور اس کے بعد بنی اُمیہ و بنی عباس کے دور میں مسلسل ہوتا رہا، اس کی وجہ سے یہ اختلافات محض عقیدہ و خیال کے اختلافات نہ رہے بلکہ ان میں وہ شدت اور حدت پیدا ہوتی چلی گئی جس نے مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو سخت خطرے میں مبتلا کر دیا۔ اختلافی بحثیں گھر گھر چل پڑیں۔ ہر بحث میں سے نئے نئے سیاسی، دینیاتی اور فلسفیانہ مسائل نکلتے رہے۔ ہر نئے مسئلے کے اٹھنے پر فرقے اور فرقوں کے اندر مزید چھوٹے چھوٹے فرقے بننے لگے۔ اور ان فرقوں کے اندر باہمی تعصبات ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ جھگڑوں اور فسادات تک نوبت پہنچ گئی۔ کوفہ، عراق کا صدر مقام، اس طوفان کا سب سے بڑا مرکز تھا، کیونکہ عراق ہی کے علاقے میں جمل، صفین اور نہروان کے معرکے ہوئے، یہیں حضرت حسینؓ کی شہادت کا دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا، یہیں تمام بڑے بڑے فرقوں کی پیدائش ہوئی، اور اسی جگہ بنی امیہ اور پھر بنی عباس نے اپنی مخالف طاقتوں کو دبانے کے لیے سب سے زیادہ تشدد استعمال کیا۔

تفرقہ و اختلاف کے اِس دَور میں جو کثیر التعداد فرقے پیدا ہوئے ان سب کی جڑ دراصل چار فرقے تھے۔ شیعہ، خوارج، مُرجِئَہ اور مُعتَزِلہ۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کے نظریات کا خلاصہ بیان کریں گے۔

شیعہ | حامیانِ علی کا گروہ ابتدا میں شیعانِ علی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اصطلاحاً انہیں صرف شیعہ کہا جانے لگا۔

اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بنی ہاشم کے کچھ لوگ، اور دوسرے لوگوں میں سے بھی چند اصحاب، ایسے تھے جو حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے اہل تر سمجھتے تھے، اور بعض کا خیال یہ بھی تھا

کہ وہ دوسرے صحابہ سے اور خصوصاً حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں، اور بعض ایسے بھی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے رشتے کی بنا پر انہیں خلافت کا زیادہ حقدار خیال کرتے تھے، لیکن حضرت عثمانؓ کے وقت تک اِن خیالات نے ایک عقیدے اور مذہب کی سی شکل اختیار نہ کی تھی۔ اِس طرزِ خیال کے لوگ خلفائے وقت کے مخالف بھی نہ تھے بلکہ پہلے تینوں خلفاء کی خلافت تسلیم کرتے تھے۔

باقاعدہ مخصوص نظریات کے ساتھ ایک پارٹی کے وجود کا آغاز اُن لڑائیوں کے زمانے میں ہوا جو حضرتِ طلحہ و زبیرؓ کے ساتھ معرکۂ جمل میں، حضرت معاویہؓ کے ساتھ صِفّین میں، اور خوارج کے ساتھ نہروان میں حضرت علیؓ کو پیش آئیں۔ پھر حضرت حسینؓ کی شہادت نے اِن لوگوں کی صفوں کو مجتمع کیا، ان کے جذبات میں شدت پیدا کی، اور ان کے نظریات کو ایک واضح شکل دے دی۔ علاوہ بریں بنو امیہ کے خلاف ان کے طرزِ حکومت کی وجہ سے عام مسلمانوں میں جو نفرت پھیلی، اور اموی و عباسی دَور میں اولادِ علی اور ان کے حامیوں پر ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں ہمدردی کے جو جذبات پیدا ہوتے، انہوں نے شیعی دعوت کو غیر معمولی طاقت بخش دی۔ کوفہ اِن لوگوں کا سب سے مضبوط قلعہ تھا۔

ان کے مخصوص نظریات یہ تھے:

۱۔ امامت (جو خلافت کے بجائے ان کی مخصوص اصطلاح ہے) مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ اُمت پر اس کا انتخاب چھوڑ دیا جائے اور امت کے بنانے سے کوئی شخص امام بن جائے بلکہ وہ دین کا ایک رکن اور اسلام کا بنیادی پتھر ہے، اور نبی کے فرائض میں سے یہ ہے کہ امام کا انتخاب امت پر چھوڑنے کے بجائے خود بحکم صریح اس کو مقرر کرے[1]۔

۲۔ امام کو معصوم ہونا چاہیے، یعنی وہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک اور محفوظ ہو، اس سے غلطی کا صدور جائز نہ ہو، اور ہر قول و فعل جو اس سے صادر ہو برحق ہو[2]۔

۳۔ حضرت علیؓ وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد امام نامزد کیا تھا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۹۶، مطبعہ مصطفیٰ محمد، مصر۔ الشہرستانی، کتاب المِلَل والنِّحَل طبع لندن، ج ۱، ص ۱۰۸-۱۰۹۔

[2] ابن خلدون، ص ۱۹۶۔ الشہرستانی ج ۱، ص ۱۰۹۔

اور وہ بربنائے نص امام تھے[۳]۔

۴۔ ہر امام کے بعد نیا امام لازماً اپنے سے پہلے امام کی نص پر مقرر ہوگا، کیونکہ اس منصب کا تقرر امت کے سپرد ہی نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے منتخب کرنے سے کوئی شخص امام ہو سکے[۴]۔

۵۔ شیعوں کے تمام گروہوں کے درمیان اس بات پر بھی اتفاق تھا کہ امامت صرف اولادِ علیؓ کا حق ہے[۵]۔

اس متفق علیہ نظریہ کے بعد شیعوں کے مختلف گروہوں کی آراء مختلف ہوگئیں۔ معتدل شیعوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت علی افضل الخلق ہیں۔ ان سے لڑنے والا یا ان سے بغض رکھنے والا خدا کا دشمن ہے۔ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور اس کا حشر کفار و منافقین کے ساتھ ہوگا۔ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ جو ان سے پہلے خلیفہ بنا دیئے گئے تھے، اگر ان کی خلافت ماننے سے علیؓ نے انکار کر دیا ہوتا اور ان سے ناراضی ظاہر کی ہوتی تو ہم کہتے کہ وہ بھی دوزخی ہیں۔ مگر چونکہ علیؓ نے ان کی سرداری مان لی اور ان سے بیعت کی اور ان کے پیچھے نماز پڑھی اس لیے ہم علیؓ کے فعل سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ہم علیؓ اور نبیؐ کے درمیان مرتبۂ نبوت کے سوا کوئی فرق نہیں کرتے اور باقی تمام حیثیتوں سے ان کو نبی کے ساتھ مشترک فضیلت دیتے ہیں[۶]۔

متشدد شیعوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت علیؓ سے پہلے جن خلفاء نے خلافت قبول کی وہ غاصب تھے اور جن لوگوں نے ان کو خلیفہ بنایا وہ گمراہ اور ظالم تھے، کیونکہ انہوں نے نبی کی وصیت کا انکار کیا اور امام برحق کو حق سے محروم کیا۔ بعض لوگ مزید تشدد اختیار کر کے پہلے تین خلفاء اور ان کے منتخب کرنے والوں کی تکفیر بھی کرتے تھے۔

---

[۳] الشہرستانی، ج ۱، ص ۱۰۸۔ ابن خلدون، ۱۹۶۔ ۱۹۷

[۴] ابن خلدون، ص ۱۹۷۔ الاشعری، مقالات الاسلامیین، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ طبع اول ج ۱، ص ۸۷۔

الشہرستانی، ج ۱، ص ۱۰۹ [۵] الشہرستانی، ج ۱، ص ۱۰۸

[۶] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۵۲۰

ان میں سب سے زیادہ نرم مسلک زیدیہ کا تھا جو زید بن علی بن حسین (متوفی ۱۲۲ھ - ۷۴۰ء) کے پیرو تھے۔ وہ حضرت علیؓ کو افضل مانتے تھے، مگر ان کے نزدیک افضل کی موجودگی میں غیر افضل کا امام ہونا جائز تھا۔ نیز ان کے نزدیک حضرت علیؓ کے حق میں شخصاً و صراحۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نص نہ تھی، اس وجہ سے وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت تسلیم کرتے تھے۔ تاہم ان کی رائے یہ تھی کہ امام اولادِ فاطمہ میں سے کوئی اہل شخص ہونا چاہیے، بشرطیکہ وہ سلاطین کے مقابلے میں امامت کا دعویٰ لے کر اٹھے اور اس کا مطالبہ کرے۔[۶]

خوارج شیعوں کے بالکل برعکس دوسرا گروہ خوارج کا تھا۔ یہ گروہ جنگِ صفین کے زمانہ میں اُس وقت پیدا ہوا جب حضرت علیؓ اور معاویہؓ اپنے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے دو آدمیوں کو حَکَم مقرر کرنے پر راضی ہو گئے۔ اُس وقت تک یہ لوگ حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے تھے مگر تحکیم پر یہ اچانک بگڑ گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کے بجائے انسانوں کو فیصلہ کرنے والا مان کر آپ کافر ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ اپنے نظریات میں دُور سے دُور نکلتے چلے گئے۔ اور چونکہ ان کے مزاج میں انتہائی تشدد تھا، نیز یہ اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں کے خلاف جنگ، اور غیر عادل حکومت کے خلاف خروج (مسلح بغاوت) کے قائل تھے، اس لیے انہوں نے ایک طویل مدت تک کشت و خون کا سلسلہ برپا رکھا، یہاں تک کہ عباسی دَور میں ان کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ ان کا بھی سب سے زیادہ زور عراق میں تھا اور بصرہ و کوفہ کے درمیان البطائح کے علاقے میں ان کے بڑے بڑے اڈے قائم تھے۔ ان کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو درست مانتے تھے مگر حضرت عثمانؓ ان کے نزدیک اپنی خلافت کے آخر زمانہ میں عدل اور حق سے منحرف ہو گئے تھے اور قتل یا عزل کے مستحق تھے۔ حضرت علیؓ نے بھی جب غیر اللہ کو حکم بنایا تو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ نیز دونوں حَکَم (یعنی حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) اور ان کو حَکَم بنانے والے (یعنی حضرت علیؓ اور حضرت

---

[۶] الاشعری، ج ۱، ص ۱۲۹ - ابن خلدون، ص ۱۹۷-۱۹۸ - الشہرستانی، ج ۱، ص ۱۱۵-۱۱۸۔

معاویہؓ) اور ان کی تحکیم پر راضی ہونے والے (یعنی علی و معاویہ کے سب ساتھی) گناہ گار تھے۔ جنگِ جمل میں شریک ہونے والے سب لوگ بھی حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ ام المومنین سمیت گناہ عظیم کے مرتکب تھے۔

۲۔ گناہ ان کے نزدیک کفر کا ہم معنی تھا۔ اور ہر مرتکبِ کبیرہ کو (اگر وہ توبہ و رجوع نہ کرے) وہ کافر قرار دیتے تھے۔ اس لیے اوپر جن بزرگوں کا ذکر ہوا ان سب کی انہوں نے علانیہ تکفیر کی بلکہ ان پر لعنت کرنے اور انہیں گالیاں دینے سے بھی وہ نہ چوکتے تھے۔ علاوہ بریں عام مسلمانوں کو بھی انہوں نے کافر ٹھیرایا، کیونکہ اوّل تو وہ گناہوں سے پاک نہیں ہیں، دوسرے وہ مذکورۂ بالا اصحاب کو نہ صرف مومن بلکہ اپنا پیشوا مانتے ہیں اور ان کی روایت کردہ احادیث سے احکام شرعیہ ثابت کرتے ہیں۔

۳۔ خلافت کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ صرف مسلمانوں کے آزادانہ انتخاب سے ہی منعقد ہو سکتی ہے۔

۴۔ وہ یہ بات نہیں مانتے تھے کہ خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتے تھے کہ قریشی یا غیر قریشی، جس صالح آدمی کو بھی مسلمان منتخب کریں وہ جائز خلیفہ ہوگا۔

۵۔ ان کا خیال تھا کہ خلیفہ جب تک عدل اور صلاح کے طریقے پر قائم رہے اس کی اطاعت واجب ہے، مگر جب وہ اس طریقے سے ہٹ جائے تو پھر اس سے لڑنا اور اس کو معزول یا قتل کر دینا بھی واجب ہے۔

۶۔ قانونِ اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے وہ قرآن کو تو مانتے تھے، مگر حدیث اور اجماع دونوں کے معاملے میں ان کا مسلکِ عام مسلمانوں سے مختلف تھا۔

ان میں سے ایک بڑا گروہ (جو النجدات کہلاتا تھا) اس بات کا قائل تھا کہ خلافت (یعنی ریاست) کا قیام سرے سے غیر ضروری ہے۔ مسلمانوں کو خود ہی حق کے مطابق اجتماعی طور پر عمل کرنا چاہیے۔ تاہم اگر وہ خلیفہ منتخب کرنے کی حاجت محسوس کریں تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

ان کا سب سے بڑا گروہ (ازارقہ) اپنے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک کہتا تھا۔ اس کا مسلک یہ تھا کہ خوارج کو اپنے سوا کسی کی اذان پر نماز کے لیے جانا روا نہیں، نہ کسی دوسرے کا ذبیحہ حلال ہے، نہ کسی دوسرے سے شادی بیاہ کا تعلق جائز ہے، نہ خارجی و غیر خارجی ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔ وہ دوسرے تمام مسلمانوں کے خلاف جہاد کو فرض عین سمجھتے تھے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا اور ان کے مال لوٹ لینا مباح جانتے تھے، اور خود اپنے گروہ کے ان لوگوں کو بھی کافر قرار دیتے تھے جو اس جہاد کے لیے نہ نکلیں۔ وہ اپنے مخالفین کے ساتھ خیانت تک کو حلال سمجھتے تھے۔ ان کے تشدّد کا حال یہ تھا کہ غیر مسلموں کو ان کے ہاں مسلمان کی بہ نسبت زیادہ امان نصیب تھی۔

ان کا سب سے زیادہ نرم گروہ اِباضیہ تھا جو عام مسلمانوں کو کافر تو قرار دیتا تھا مگر مشرک کہنے سے اجتناب کرتا تھا۔ ان لوگوں کا قول تھا کہ یہ "غیر مومن" ہیں۔ وہ ان کی شہادت قبول کرتے تھے۔ ان سے شادی بیاہ اور توارث جائز رکھتے تھے۔ اور ان کے علاقے کو دارالکفر یا دارالحرب نہیں بلکہ دارِ توحید کہتے تھے، البتہ حکومت کے مراکز کو وہ اس سے مستثنیٰ رکھتے تھے۔ مسلمانوں پر چھپ کر حملہ کرنا ان کے نزدیک ناجائز تھا، البتہ علانیہ لڑنا وہ صحیح سمجھتے تھے۔[۵۵]

مُرجِئَہ شیعوں اور خارجیوں کے انتہائی متضاد نظریات کا ردِّعمل ایک تیسرے گروہ کی پیدائش کی صورت میں ہوا جسے مُرجِئَہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کی لڑائیوں میں جس طرح کچھ لوگ ان کے پُرجوش حامی اور کچھ اُن کے سخت مخالف تھے، اسی طرح ایک طبقہ غیر جانبدار لوگوں کا بھی تھا، جو یا تو خانہ جنگی کو فتنہ سمجھ کر الگ بیٹھ رہا تھا، یا پھر اس معاملے میں

---

۵۵ عبدالقاہر بغدادی، الفَرق بین الفِرَق، مطبعۃ المعارف، مصر، صفحات ۵۵-۶۱-۶۳-۶۴-۶۷-۶۸-۸۲-۸۳-۹۹-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-

الشہرستانی، ج ۱، صفحات ۸۷، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۱۰۰

الاشعری، ج ۱، صفحات ۱۵۶، ۱۵۷-۱۵۹، ۱۸۹، ۱۹۰- المسعودی، ج ۲، ص ۱۹۱

مذبذب تھا کہ حق فریقین میں سے کس کے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اس بات کو تو ضرور محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کا آپس میں کشت و خون ایک بڑی برائی ہے، مگر وہ لڑنے والوں میں سے کسی کو برا کہنے کے لیے تیار نہ تھے اور ان کا فیصلہ خدا پر چھوڑتے تھے کہ آخرت میں وہی طے کرے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ اس حد تک تو ان کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے مختلف نہ تھے۔ لیکن جب شیعوں اور خارجیوں نے اپنے انتہا پسندانہ نظریات کی بنا پر کفر و ایمان کے سوالات اٹھانے شروع کیے اور ان پر جھگڑوں، بحثوں اور مناظروں کا سلسلہ چلا، تو اس غیر جانبدار طبقے نے بھی اپنے نقطۂ نظر کے حق میں مستقل دینیاتی نظریات قائم کر لیے جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱- ایمان صرف خدا اور رسول کی معرفت کا نام ہے، عمل اس کی حقیقت میں شامل نہیں ہے، اس لیے ترکِ فرائض اور ارتکابِ کبائر کے باوجود ایک شخص مومن رہتا ہے۔

۲- نجات کا مدار صرف ایمان پر ہے۔ کوئی معصیت ایمان کے ساتھ آدمی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ آدمی کی مغفرت کے لیے بس یہ کافی ہے کہ وہ شرک سے مجتنب ہو اور توحید کے عقیدے پر مرے[۹]

بعض مرجئہ نے اسی اندازِ فکر کو آگے بڑھا کر یہ قول اختیار کیا کہ شرک سے کم تر جو برے سے برے افعال بھی کیے جائیں وہ لامحالہ بخشے جائیں گے[۱۰] اور بعضوں نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہا کہ آدمی اگر دل میں ایمان رکھتا ہو اور وہ دارالاسلام میں بھی، جہاں کسی کا خوف نہیں، زبان سے کفر کا اعلان کرے یا بت پوجے یا یہودیت یا نصرانیت میں داخل ہو جائے، پھر بھی وہ کامل الایمان اور اللہ کا ولی اور جنتی ہے[۱۱]۔ ان خیالات نے معاصی اور فسق و فجور اور

۹؎ الشہرستانی، ج ۱، ص ۱۰۴-۱۰۳۔ الاشعری، ج ۱، ص ۱۹۸، ۲۰۱

۱۰؎ الشہرستانی، ج ۱، ص ۱۰۴

۱۱؎ ابنِ حزم، الفصل فی الملل والنحل، ج ۴، ص ۲۰۴، المطبعۃ الادبیہ، مصر، ۱۳۱۷ھ۔

ظلم وستم کی بڑی ہمت افزائی کی اور لوگوں کو اللہ کی مغفرت کا بھروسا دلا کر گناہوں پر جری کر دیا۔

اِس طرزِ خیال سے ملتا جلتا ایک اور نقطۂ نظر یہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اگر اس کے لیے ہتھیار اٹھانے کی ضرورت پڑے، ایک فتنہ ہے۔ حکومت کے سوا دوسروں کے بُرے افعال پر ٹوکنا تو ضرور جائز ہے مگر حکومت کے ظلم وجور کے خلاف زبان کھولنا جائز نہیں[۱۲۲]۔ علامہ ابوبکر جصاص اس پر بڑے تلخ انداز میں شکایت کرتے ہیں کہ ان باتوں نے ظالموں کے ہاتھ مضبوط کیے اور بُرائیوں اور گمراہیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی قوتِ مدافعت کو سخت نقصان پہنچایا۔

مُعتزلہ اسی ہنگامہ خیز دور میں ایک چوتھا طرزِ فکر پیدا ہوا جس کو اسلامی تاریخ میں "اعتزال" کا نام دیا گیا ہے۔ اگرچہ پہلے تین گروہوں کی طرح اِس کی پیدائش خالص سیاسی اسباب کا نتیجہ نہ تھی، لیکن اس نے بھی اپنے وقت کے سیاسی مسائل میں چند قطعی نظریات پیش کیے اور اُس مجادلۂ افکار و آراء میں پوری شدت کے ساتھ حصہ لیا جو اُس وقت سیاسی اسباب سے تمام دنیائے اسلام میں عموماً، اور عراق میں خصوصاً چھڑا ہوا تھا۔ اِس مسلک کے بانی واصل بن عطاء (۸۰-۱۳۱ھ / ۶۹۹-۷۴۸ء) اور عَمرو بن عُبَید (متوفی ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء) تھے اور ابتداءً بصرہ ان کی بحثوں کا مرکز تھا۔

ان کے سیاسی نظریات[۱۲۳] کا خلاصہ یہ ہے:

۱- ان کے نزدیک امام کا تقرر (یعنی ریاست کا قیام) شرعاً واجب تھا۔ لیکن بعض مُعتزلہ کی رائے یہ تھی کہ سرے سے امام کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر امت خود عدل پر قائم رہے تو کسی امام کا تقرر فضول ہے[۱۲۴]۔

۲- ان کی رائے تھی کہ امام کا انتخاب امت پر چھوڑا گیا ہے اور امت ہی کے انتخاب سے امامت منعقد ہوتی ہے[۱۲۵]۔ بعض معتزلہ اس پر مزید شرط یہ لگاتے تھے کہ امامت کے انعقاد کے

---

[۱۲۲] الجصاص احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۰، المطبعۃ البہیہ، مصر، ۱۳۴۷ھ۔

[۱۲۳] المسعودی، ج ۲، ص ۱۹۱

[۱۲۴] ایضاً

لیے تمام امت کا اتفاق ہونا چاہیے اور فتنہ واختلاف کی حالت میں امام کا تقرر نہیں کیا جاسکتا۔[15]

۳- ان کا قول تھا کہ امت جس صالح اور اہل مسلمان کو چاہے امام منتخب کر سکتی ہے اس میں قریشی اور غیر قریشی، یا عربی اور عجمی کی کوئی قید نہیں[16]۔ بعض معتزلہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے تھے کہ عجمی کو امام بنانا زیادہ بہتر ہے، بلکہ اگر مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کو بنایا جائے تو یہ اور بھی اچھا ہے، کیونکہ اگر امام کے حامی زیادہ نہ ہوں تو ظلم وجور کی صورت میں اسے ہٹانا زیادہ آسان ہوگا[17]۔ گویا حکومت کے استحکام کی بہ نسبت انہیں زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ حکمران کو معزول کرنے میں سہولت ہو۔

۴- ان کی رائے میں فاجر امام کے تحت جمعہ و نماز جائز نہ تھی[18]۔

۵- ان کے بنیادی اصولوں میں سے ایک امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی تھا۔ وہ عدل اور راستی سے ہٹ جانے والی حکومت کے خلاف خروج (بغاوت) کو واجب سمجھتے تھے جبکہ ایسا کرنے کی قدرت حاصل ہو اور کامیاب انقلاب برپا کیا جاسکتا ہو[19]۔ چنانچہ اسی بنا پر انہوں نے اُموی خلیفہ ولید بن یزید (۱۲۵-۱۲۶ھ / ۷۴۳-۷۴۴ء) کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا اور اس کی جگہ یزید بن ولید کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کی کیونکہ وہ مسلک اعتزال میں ان کا ہم خیال تھا[20]۔

۶- خوارج اور مُرجِیَہ کے درمیان کفر وایمان کے معاملہ میں جو جدال برپا تھا اس میں انہوں نے اپنا فیصلہ یہ دیا کہ گناہ گار مسلمان نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ بیچ کی ایک حالت پر ہے[21]۔

---

[15] الشہرستانی، ج ۱، ص ۵۱

[16] المسعودی، ج ۲، ص ۱۹۱

[17] الشہرستانی، ج ۱، ص ۶۳

[18] الاشعری، ج ۲، ص ۱۲۴

[19] الاشعری، ج ۲، ص ۱۲۵ [20] المسعودی ج ۲، ص ۱۹۰، ۱۹۳، السیوطی: تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۵، نور محمد پبلشرز کراچی

[21] الفرق بین الفرق، ص ۹۴-۹۵

ان نظریات کے علاوہ ان لوگوں نے صحابہ کے اختلافات، اور پچھلی خلافتوں کے مسئلے میں بھی بے باکانہ اپنے فیصلے صادر کیے۔ واصل بن عطاء کا قول تھا کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے فریقین میں سے کوئی ایک گروہ فاسق تھا، مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسا فریق فسق کا مرتکب ہوا تھا۔ اسی بنا پر وہ کہتا تھا کہ اگر علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ میرے سامنے ترکاری کی ایک گٹھی پر بھی گواہی دیں تو میں قبول نہ کروں، کیونکہ ان کے فاسق ہونے کا احتمال ہے۔ عمرو بن عُبَید کی رائے تھی کہ فریقین فاسق تھے[۲۱] حضرت عثمان پر بھی انہوں نے سخت تنقید کی حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے حضرت عمرؓ کو بھی مطعون کر ڈالا[۲۲] علاوہ بریں بہت سے معتزلہ قانونِ اسلامی کے مآخذ میں سے حدیث اور اجماع کو قریب قریب ساقط کر دیتے تھے[۲۳]

سوادِ اعظم کی حالت ان متحارب اور متشدد گروہوں کے درمیان مسلمانوں کا سوادِ اعظم اپنے خیالات میں انہی نظریات اور اصولوں پر قائم تھا جو خلفاء راشدین کے زمانے سے مسلّم چلے آ رہے تھے اور جنہیں جمہور صحابہ و تابعین اور عامۂ مسلمین ابتدا سے اسلامی اصول و نظریات سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی بمشکل ۸-۱۰ فی صدی آبادی اس تفرقے سے متاثر ہوئی تھی۔ باقی سب لوگ مسلکِ جمہور ہی پر قائم تھے۔ مگر ان اختلافات شروع ہونے کے بعد سے امام ابوحنیفہ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہلِ اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظامِ فکر کی شکل میں مرتب ہوتی، بلکہ مختلف فقہاء و محدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال، فتاویٰ، روایات، یا طرزِ عمل سے منتشر طور پر اس کے کسی پہلو کو واضح کرتے رہتے تھے۔

۲۱۔ الفرق بین الفرق، ص ۱۰۱-۱۰۰۔ الشہرستانی، ج ۱، ص ۴۴۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۳۳-۱۴۴۔ ایضاً، ج ۱، ص ۴۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۹-۱۳۸

جہادِ پاکستان اور دُنیائے اسلام

(خلیل حامدی)

بھارت و پاکستان کی جنگ سے جہاں یہ حقیقت عیاں ہوگئی ہے کہ اسلام لامتناہی روحانی اور اخلاقی طاقت رکھتا ہے، وہاں یہ ثبوت بھی عملی طور پر فراہم ہوگیا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا رشتہ ہے جس نے لسانی اختلافات اور جغرافیائی حدبندیوں کے باوجود مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو باہم پیوستہ کر رکھا ہے، اور نسل و وطن کی رنگا رنگی کے علی الرغم آج بھی اُن پر ایک ہی رنگ غالب ہے اور وہ ہے اسلامی عقیدے کا رنگ۔ اِدھر بھارت کی درندگی و وحشیت نے پاکستان کو للکارا اور اُدھر ملّتِ اسلامی کا ہر فرد سراپا اضطراب، ہمہ تن احتجاج و مذمّت اور مجسّم دعا و التجا بن گیا۔ پاکستان نے برہمنی سامراج اور ہندوازم کی جارحیت کے جواب میں نعرۂ جہاد بلند کیا۔ اس نعرے کی صدائے بازگشت نہ صرف پاکستان کے بام و در سے اٹھی بلکہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر سوڈان تک اس کی گونج بلند ہوئی۔ جہاد کا یہ نعرہ ایسا شعلہ ساماں، ولولہ افزا اور خُمار بداماں نکلا کہ جہاں جہاں پہنچا لبیک وسعدیک کی آوازیں آنے لگیں، اور جہاں جہاں رشتۂ اسلام سے وابستگان موجود تھے وہ سکون نا آشنا موج میں تبدیل ہوگئے۔ یہ رشتہ جتنا گہرا تھا ارتعاش اتنا ہی فراواں تھا۔

ہمارے پاس اخبارات و مجلّات کے ذریعہ سے، نیوز ایجنسیوں کی وساطت سے شخصی مراسلات کی بدولت جہادِ پاکستان کے ردِّ عمل کی جو معلومات بہم پہنچی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مسلم عوام نے پاکستان و بھارت کی جنگ کو کفر و اسلام کی جنگ، توحید و بُت پرستی کی آویزش اور صنم تراش و صنم شکن کی پیکار قرار دیا ہے۔ پاکستان کو سب سے بڑا اسلامی ملک ہونے کی حیثیت

سے اپنا حقیقی بھائی اور اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھا ہے۔ پاکستان پر حملے کو اپنے اوپر حملہ محسوس کیا ہے اور بھارت کی مذموم جارحیت کو ملتِ اسلامیہ کے خلاف چیلنج گردانا ہے۔ اس باب میں مسلم دنیا کی اسلامی تنظیموں، دینی رہنماؤں اور اسلام پسند عناصر کا زرّیں کردار خاص مطالعہ کا مستحق ہے انہوں نے عوام میں یہ جوش پیدا کیا کہ وہ جہادِ پاکستان کی تائید کریں اور اس معرکۂ خیر و شر میں وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے تحفظ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔

جہادِ پاکستان کی حمایت اور بھارتی جارحیت کی مذمت کے لیے دنیا کے مسلمان عوام نے اور اسلامی جماعتوں نے قانون و اخلاق کی حدود میں رہ کر ہر وہ طریقہ استعمال کیا ہے جو عالمی طاقتوں کو اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے کیا جا سکتا تھا کہ فرزندانِ اسلام کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے حق میں مظاہرے کیے گئے ہیں، احتجاجی جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پبلک اجتماعات میں پاکستان کی حمایت میں قراردادیں پاس کی گئی ہیں، نمائندہ وفود نے پاکستان کے سفارت خانوں میں جا کر اپنی حمایت و تائید کی یقین دہانی کی ہی ہے، حکومتِ پاکستان کو تعاون کی پیش کش اور بھارت کو ملامت کے تار بھیجے ہیں، دارالافتاؤں نے جہادِ پاکستان و کشمیر کے حق میں فتوے جاری کیے ہیں، اہلِ صحافت و ادب نے تا بحدِ امکان اِس جہاد میں حصہ لیا ہے، اربابِ علم و دانش نے سیاسی و فکری پہلو سے جہاد کی اہمیت و ضرورت کو واضح کیا ہے۔ جماعتوں اور شخصیتوں نے اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ پاکستان سے تعاون کریں، حکومتوں اور عوام کے نمائندہ اداروں اور کانفرنسوں سے تائید و حمایت کا مطالبہ کیا ہے، رضاکاروں کی پیش کش کی ہے، مالی امداد کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے۔ گرم آنسوؤں اور سرد آہوں کے ساتھ مقدس مقامات پر بارگاہِ خداوندی سے پاکستان کی فتح کی دعائیں کی ہیں۔

انڈونیشیا کی حکومت اور عوام نے تو اسلامی اخوت اور انسان دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایران اور ترکی نے بھی سرکاری سطح اور عوامی پیمانے پر قابلِ قدر بھائی، دوست اور حلیف کا مثالی نمونہ پیش کیا ہے۔ اُردن کی حمایت پر پاکستان کا ہر شہری سراپا سپاس ہے۔ سعودی عرب

کا تعاون ہمارے لیے اخلاقی اور مادی دونوں حیثیتوں سے حوصلہ افزائی کا پیغام لے کر آیا ہے۔
ہم اس جائزے میں صرف مسلم عوام اور اسلامی تنظیموں کی کارکردگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ قوت و طاقت، اخوت و مواسات اور تعاون و مدافعت کا اصل منبع عوام ہی ہیں۔ حکومتوں کی مصلحتیں تغیر پذیر ہوتی ہیں مگر یہ منبع ناقابلِ تغیر ہے۔ حکومتیں خارجی حالات سے متاثر ہوسکتی ہیں مگر عامۂ مسلمین کے جذباتِ ربط و تعاون کے ریشے ایک ایسی اندرونی اساس میں پیوست ہیں جس میں ۱۴ سو سال کے طویل عرصہ میں بھی کوئی تبدیلی و تزلزل پیدا نہیں ہوسکا۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَاءِ۔

اس جائزے کے آغاز سے پہلے ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان نے پچھلے کئی برس سے، بلکہ تقسیم کے فوراً بعد سے عرب ممالک کے اندر اپنے پروپگنڈے کا وسیع جال پھیلائے رکھا ہے۔ اور ہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ پروپگنڈہ اپنے تنوع اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے بظاہر بڑا اثر انگیز اور خطیر تھا۔ ہندوستان نے بڑے بڑے ہندو فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں اور سیاسی لیڈروں کے افکار و نظریات وسیع پیمانے پر عربی زبان میں منتقل کیے۔ اپنے اکابر کی زندگیوں پر تصنیفوں کے انبار لگا دیئے۔ بعض عربی اخبارات کی درپردہ خدمات حاصل کیں جنہوں نے ہندوستان کے پروپگنڈے کو فروغ دینے کے ساتھ پاکستان کا چہرہ مسخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ سفارتی سطح سے الگ ایک مستقل پروپگنڈا مشنیری کا انتظام قائم کیا جس میں تجربہ کار اہلِ قلم اور عربی دان سکالروں کو بھاری معاوضے دے کر مختلف میدانوں میں ہندوستان کی برتری کا سکہ جمانے کی خدمت پر مامور کیا۔ اس معاملے میں اسرائیل کی خفیہ مشنیری نے بھی ہندوستانی حربوں کو فروغ دینے میں پورا تعاون کیا ہے۔

اِن تمام پروپگنڈہ سرگرمیوں کے نتیجے میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ کوئی مکتبہ ایسا نہ تھا جس میں بھارتی لٹریچر کے ڈھیر نہ پڑے ہوں۔ اس طوفانِ کذب و افتراء سے بلاشبہ عربوں کے بعض حلقے غبار آلود ہوگئے تھے۔ مگر اسلام پسند عنصر ایسا سخت جان نکلا کہ یہ تمام طوفان خیزیاں اُس کے

ایمان کو متزلزل نہ کر سکیں۔ پاکستان سے پہلے ہی روز ان کو جو وابستگی پیدا ہو گئی تھی وہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہی۔ ۱۹۴۹ء کی بات ہے کہ شام کی اخوانی تنظیم کے رہنما ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم نے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم سے کہا تھا کہ پاکستان ہمارے دلوں پر بنا ہے، اس کا تحفظ ہمارے ضمیر و ایمان کا تقاضا ہے۔ مرحوم لیاقت علی خان نے یہ سُن کر کہا تھا کہ آپ لوگوں کی موجودگی میں ہمیں سفارتی نمائندے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جذبہ اب بھی موجود ہے۔ ہندوستان کا پروپگنڈہ اس کو محو کرنے میں کسی پہلو سے کامیاب نہیں ہُوا۔ بلکہ اب پاکستان کے نعرۂ جہاد نے اسے اور دو آتشہ کر دیا ہے۔ یہ اسی جذبے کے کرشمے ہیں کہ حکومتوں کے موقف کی طرف دیکھے بغیر مسلم عوام نے پاکستان کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ اور آئندہ بھی اُن سے یہی توقع رکھنی چاہیے۔ البتہ اب یہ ہمارا اپنا فرض ہے کہ ہم ایسے پائیدار عناصر سے مربوط رہیں۔ خدا نے چاہا تو یہی عناصر حکومتوں کی پالیسیوں کو بھی ہمارے حق میں ہموار رکھنے اور ہموار کرنے کے لیے بلا مزد خدمت سرانجام دیتا رہے گا۔

ایک اور امر کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے۔ پاکستان کے حق میں جن ممالک کی آوازیں ہم تک پہنچی ہیں وہ زیادہ تر مشرقِ اوسط اور شمالی افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشرقی افریقہ اور مغربی اور سنٹرل افریقہ کے اکثر ممالک سے حمایت و تائید کی آواز اگر اٹھی ہے تو وہ ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ ان حصوں میں ایسے نو آزاد ممالک کی کثیر تعداد ہے جہاں کی اکثریت مسلمان ہے اور حکومت بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے جیسے مشرقی افریقہ میں صومالی لینڈ، زنجبار وغیرہ۔ اور مغربی افریقہ میں سنی گال، مالی، گینیا، گامبیا وغیرہ۔ یا ایسے ممالک جن کی مسلم آبادی پچاس فیصد یا اس سے زائد ہے اور گو حکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے مگر مسلم آبادی کے اثرات گہرے ہیں جیسے مشرقی افریقہ میں ٹانگانیکا اور مغربی اور وسطی افریقہ میں گیبون، کیمرون، داہومی، چاڈ، اپر وولٹا۔ اور دوسری متعدد افریقی ریاستیں جو حال ہی میں آزاد ہوتی ہیں یا آزادی کے دروازے پر ہیں۔ مغربی افریقہ میں سے صرف نائیجیریا اور سنی گال کی حمایت کا حال ہمیں معلوم ہے۔ جمہوریہ سنی گال کے سفیر نے جدہ میں کہا ہے کہ بھارت نے پاکستان

پر جو حملہ کیا ہے ہم اُسے سنی گال پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح نائیجیریا کی حکومت اور عوام کی طرف سے بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ پاکستان کی حمایت کی گئی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ افریقہ کی تمام مُسلم آبادیوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ ان آبادیوں میں لاتعداد ایسی اسلامی تنظیمیں اور مذہبی شخصیتیں موجود ہیں جو پاکستان کے حق میں بڑے پاکیزہ اور مخلصانہ جذبات رکھتی ہیں۔ اور جو اسی پیمانے پر بھارتی سامراج کے ناپاک عزائم سے عوام کو آگاہ کر سکتی ہیں اور امید ہے کہ کر رہی ہونگی جس پیمانے پر مشرق اوسط اور انڈونیشیا کی عوامی تنظیموں نے بھارت کا پول کھولا ہے۔ مغربی افریقہ میں شمالی نائیجیریا کے وزیر اعظم احمد وبیلو کی شخصیت مُسلم حلقوں میں بے پناہ اثر و نفوذ رکھتی ہے۔ موصوف میدانِ سیاست میں جتنے صاف گو اور نڈر ہیں مذہب کے معاملے میں بھی اتنے ہی بے لوث اور جذبہ آگیں ہیں۔ پاکستان کے لیے اپنے دل میں محبت و خیر سگالی کے اچھے جذبات رکھتے ہیں۔ اسی طرح سنی گال کے شیخ الاسلام ابراہیم انیاس مغربی افریقہ کے عوام میں غیر معمولی مقبولیت کے مالک ہیں۔ ان ریاستوں میں ان کے لاکھوں سے متجاوز پیرو پائے جاتے ہیں۔ افریقہ کی لادین، بُت پرست اور عیسائی آبادیوں میں انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا غلغلہ بلند کر رکھا ہے۔ احمد وبیلو اور ابراہیم انیاس ایسی شخصیتوں کے ذریعہ سرکاری اور عوامی میدان میں بھارت کی درندگی کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔

بھارت نے جارحانہ کارروائیوں کے بعد دنیا کو دھوکا دینے کے لیے اپنے لیڈروں کو بیرونی ممالک کے دَورے پر بھیج رکھا ہے۔ بھارت کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن مثل مشہور ہے کہ دشمن کو حقیر نہ جانو۔ اس لیے ہمیں ان دوروں کا پُورا نوٹس لینا چاہیے۔ بھارت کے صدر رادھا کرشنن نے حال ہی میں حبشہ کا دورہ کیا ہے۔ وہ اس دورہ کے ذریعہ حبشہ کے حکمران ہیلا سلاسی کو افریقی ممالک میں اپنی سامراجی پالیسیوں کا زہر پھیلانے کے لیے آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لیے بھارت ہیلا سلاسی کے علاوہ اسرائیل کی خدمات بھی حاصل کر رہا ہے۔ اسرائیل اور بھارت میں خفیہ طور پر نہایت درجہ مستحکم تعلقات استوار ہو چکے ہیں۔ دوسری

جانب افریقہ کے متعدد ممالک میں اسرائیل نے اقتصادی اور ثقافتی میدانوں میں اپنا جال بچھانے کی کوششیں شروع کر رکھی ہیں۔ میلاسلاسی کے اسرائیل سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس لیے یہ امکان ہے کہ بھارت میلاسلاسی پر اسرائیل کا دباؤ ڈال کر بعض افریقی ریاستوں کو اپنا ہمنوا کرنا چاہتا ہو۔ اور آئندہ الجزائر میں منعقد ہونے والی افرایشیائی کانفرنس میں اپنی جارحیت کی جوابدہی سے بچ نکلنا چاہتا ہو۔ اگرچہ ہمیں امید ہے کہ اس کانفرنس میں اوّل تو بھارت شرکت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا اور بلطائف الحیل کنارہ کشی اختیار کرے گا، اور اگر شریک ہو بھی گیا تو ذلیل ہو کر نکلے گا۔ لیکن ہمیں اپنی جگہ اس کی ان تمام سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے متنبہ رہنا چاہیے جو وہ خاص طور پر افریقی ممالک میں جاری رکھے ہوئے ہے۔

ان ابتدائی گذارشات کے بعد ہم عالمِ اسلام میں جہادِ پاکستان کے ردِّعمل کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر دنیائے اسلام کے پورے ردِّعمل کا احاطہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف عوامی سطح پر جو کچھ ہوا ہے اس پر ایک طائرانہ نگاہ مدعائے تحریر ہے۔

جہادِ پاکستان کی حمایت میں جس مسلمان ملک نے پیش قدمی کا سہرا حاصل کیا ہے وہ انڈونیشیا ہے۔ انڈونیشیا کی حکومت کے ہم تہ دل سے سپاس گزار ہیں کہ اس نے ہماری حمایت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انڈونیشیا کے عوام نے بھی تعاون و اخوت کی تاریخ میں سنہری باب کا اضافہ کیا ہے۔ انڈونیشیا کی تمام عوامی تنظیموں اور سماجی اور اقتصادی اداروں نے پاکستان کی قولی اور عملی حمایت کی ہے۔ انڈونیشیا کی فضائی سروس کے کارکنوں کی ایسوسی ایشن نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے کے پیشِ نظر انڈونیشیا کی سرزمین پر بھارتی فضائی سروس کے طیاروں کے اترنے کا حق ضبط کر لے۔ جکارتہ کے معروف و مقبول اخبار "ہریان راجکارٹ" نے لکھا کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر کے افرایشیائی ممالک میں اپنی پوزیشن خراب کر لی ہے۔ اور اب وہ اس برادری میں تنہا رہ گیا ہے۔ اخبار "سلوانڈونیشیا" نے لکھا کہ بھارت کی جارحانہ کارروائی نے ایشیا کے عوام کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ "سوکوگورو ریولیوشن" نے

اپنے اداریہ میں افریشیائی ممالک سے اپیل کی کہ وہ دوسری افریشیائی کانفرنس کو کامیاب بنانے اور بھارتی سامراجیت کو شکست دینے کے لیے اپنے اتحاد کو مضبوط بنائیں نیشنل سٹوڈنٹس مومنٹ نے انڈونیشی حکومت سے کہا کہ دوسری افریشیائی کانفرنس میں بھارت کو شریک نہ ہونے دیا جائے۔ یونیورسٹی سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بھی اپیل کی کہ بھارتی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنے والے پاکستان اور کشمیر کے دلیر عوام کی امداد کی جائے۔ انڈونیشیا کی "امن کمیٹی" کی طرف سے بھارتی حکومت کے نام ایک تار میں کہا گیا کہ بھارت کے مذموم اقدام نے ایک مرتبہ پھر یہ ظاہر کردیا ہے کہ بھارت کشمیری عوام کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔" جکارتہ کو آپریشن اسمبلی" کی طرف سے ایک بیان میں کشمیر کے لوگوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کی گئیں۔ افرو ایشین جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی جانب سے آزاد کشمیر اور پاکستان کی سرحدوں پر بھارت کی کھلم کھلا جارحیت کی شدید مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ شاستری حکومت کی اس عیارانہ اور بزدلانہ چال کا مقصد پچاس لاکھ کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت سے محروم کرنا ہے اور کشمیر پر جابرانہ قبضہ برقرار رکھنا ہے۔ جس روز بھارت کے جہاز قصور اور سیالکوٹ کے نہتے شہریوں پر بمباری کر رہے تھے عین اُسی دن جکارتہ میں چالیس لاکھ افراد بھارتی جارحیت کی مذمت میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور انڈونیشیا کی سب سے بڑی دینی جماعت نہضتہ العلماء کے مرکز سے اپنی شاخوں کو یہ ہدایات بھیجی جارہی تھیں کہ وہ پاکستان کے لیے رضاکار بھیجنے کے لیے تیار رہیں۔ دوسری سیاسی اور دینی تنظیموں کی طرف سے بھی رضاکار بھیجنے کی پیش کش کی گئی۔ الغرض انڈونیشیا کی تمام انجمنوں اور اخبارات اور سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے پاکستان کی حمایت اور بھارت کی مذمت میں جس جوش کا مظاہرہ کیا گیا اُس کی وجہ سے انڈونیشیا کے اندر بسنے والے ہندوؤں کے لیے یہ زمین اس قدر تنگ ہوگئی کہ انہوں نے سروں پر جناح کیپ پہننا شروع کر دی تاکہ دیکھنے والا انہیں پاکستانی شہری سمجھے۔

ترک عوام اور ترک حکومت نے بھی ایک اسلامی ملک کی تائید وحمایت میں اپنی تاریخی

روایات کو زندہ کر دیا ہے۔ ترکی کی تمام سرکردہ پارٹیوں کے زعماء نے انقرہ میں پاکستانی سفیر سے ملاقات کی۔ اور انہیں یقین دلایا کہ ترکی کے تمام مسلمانوں کی ہمدردیاں پاکستانی بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ اور ترکی پاکستان کی پوری مدد کرے گا۔ پیپلز ریپبلکن پارٹی کے قائدین کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان پر بزدلانہ حملہ کیا گیا ہے۔ کشمیر پر پاکستان کا پورا پورا حق ہے ہم پاکستان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہیں۔ پاکستان پر جو مصیبت بھی آئے گی ترکی کا ہر گھر اسے اپنی مصیبت سمجھے گا۔ ترکیہ کے مشہور سیاسی لیڈر اکبر علی جان نے کہا "اپنے ہمسایہ بھائی پاکستان پر جارحانہ حملہ سے ترکی کے باشندوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ہماری حکومت اس سلسلہ میں ٹھوس قدم اٹھانے والی ہے"۔ ترکی صحافت نے بھی پاکستان کی پوری پوری حمایت کی۔ استنبول کے ممتاز جریدہ "استقلال" نے اپنے ایک شمارہ میں پاکستانی بھائیوں کے نام ایک پیغام میں کہا: "آپ نے ۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس، ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان، پہلی جنگِ عظیم اور ہماری جدوجہد آزادی میں ہماری جو اعانت کی ہے ہم نے اُسے فراموش نہیں کیا ہے۔ ترکی کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں"۔ پاکستان پر حملہ کے ایام میں ترکی کے ایک حصّے سے لے کر دوسرے حصّے تک پاکستان کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ مشہور تاریخی مسجد جامع سلطان احمد کے سامنے یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کا ایک تاریخی اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں روس، امریکہ، برطانیہ اور دوسرے سفارت خانوں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ ترک طلبہ کے رہنماؤں نے پُرجوش تقریریں کیں۔ اس جلسہ میں ایک طالب علم نے یہ نظم پڑھی: "اے اللہ، پاکستان کو کشمیر میں ایسی ہی فتح عطا فرما جیسی ہمیں ازمیر (سمرنا) میں ہوئی تھی"۔ مجمع آمین اور زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا کہ ترکی اور پاکستان یک جان دو قالب ہیں۔ دونوں کے قلب ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ترک پاکستانیوں کو کبھی نہیں بھول سکتے جو ہر مصیبت میں ترکوں کے کام آتے رہے ہیں۔ قبرص کے مسئلہ میں بھی ترکیہ کو پاکستان کی پوری پوری حمایت حاصل رہی ہے۔ ترکی کے پچاس ہزار جوانوں نے پاکستان کو اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔ جلسے کے خاتمہ کے بعد ہجوم

ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں مختلف بازاروں اور سڑکوں کا گشت کرتا رہا۔ جلوس نے بیشمار کتبے اٹھا رکھے تھے جو فتح کے دعائیہ نعروں سے مرقوم تھے۔ بعض کتبوں پر تصویروں سے پاکستان کو ایک مسجد اور بھارت کو ایک خشمناک گائے سے تشبیہ دی گئی تھی جو مسجد میں گھسنے کے لیے مجنونانہ طور پر سر پھوڑ رہی تھی۔ ترکی کی تمام مساجد میں پاکستان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔ یوم پاکستان کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر ترک مرد اور خواتین نے رو رو کر پاکستان کی نصرت و کامرانی کے لیے دعائیں کیں۔ اخبارات، سیاسی جماعتیں، ادبی اور ثقافتی انجمنیں، ہر کوئی اس جذبہ سے سرشار ہے کہ پاکستان کی مدد کی جائے۔ جب انہیں پاکستان کی بہادر فوجوں کی فتحمندی کی خبریں پہنچتیں تو وہ جوش سے بے قابو ہو جاتے۔

ایران کے عوام بھی انڈونیشیا اور ترکی کے عوام کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔ ایران کے نامور اخبارات مثلاً اطلاعات، تہران جرنل، پیغام امروز، ندائے مردم، کیہان، "ڈپلومیٹ" اور دوسرے جرائد و مجلات مجاہدینِ کشمیر اور عساکرِ پاکستان کو زبردست خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔ اور بھارتی جارحیت کی مذمت اور پاکستان کی حمایت میں اس امر کا عملی ثبوت پیش کر چکے ہیں کہ ایران پاکستان کا حقیقی بھائی، مخلص دوست اور وفاشعار حلیف ہے۔ ایران کے سب سے بڑے مذہبی مرکز قمؔ کے مشائخ اور روحانیوں کی جانب سے بذریعہ تار پاکستان کے لوگوں کی حمایت کی جا چکی ہے۔ علمائے قمؔ کی طرف سے شیخ محمد الصادق روحانی نے ایک تار میں جو موصوف نے ایران میں پاکستانی سفارت خانے، لاہور کے شیعہ رہنماؤں اور جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھیجا ہے، یہ کہا کہ "پاکستان پر ہندوستان کا جارحانہ حملہ اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ حوزہ علمیہ (قم)، کے علماء مشایخ، قم کے عوام اور مسلمانانِ ایران کے لیے شدید رنج کا موجب ہوا ہے۔ ہم اس اقدام کی مذمت کرتے ہیں اور مجاہدینِ کشمیر کے جہاد مقدس سے پوری ہمدردی اور تائید کا اظہار کرتے ہیں۔"

اُردن کی حکومت اور عوام نے پاکستان کی حمایت کا واضح موقف اختیار کرکے عرب لیگ کے ادارے کے سامنے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کی ہے۔ اُردن کے وزیر اعظم جناب وصفی التل نے ایک تقریب میں کہا کہ پاکستان نے ہمیشہ فلسطین کے مسئلہ میں عربوں کا ساتھ دیا ہے۔ اور اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس حمایت کا کچھ نہ کچھ بدلہ چکائیں۔ اُردن کے پریس نے پاکستان کی خبروں کو اس طرح سے شائع کیا گویا بھارت نے پاکستان پر حملہ نہیں کیا بلکہ اردن پر کیا ہے۔ اُردن کے مدیرانِ جرائد کے صدر جناب محمود الشریف، جو روزنامہ المنار کے ایڈیٹر اور مصر کے سابق اخوانی رہنما ہیں، نے اعلان کیا کہ اُردن کا پورا پریس پاکستان کے ساتھ ہے۔ اخوان المسلمون اُردن کے جنرل سکرٹری عبد الرحمٰن خلیفہ ایک تار کے ذریعہ پاکستان کی حمایت کرچکے ہیں۔ اور تمام عرب حکمرانوں سے بھی بذریعہ تار پاکستان کی حمایت کی اپیل کرچکے ہیں۔ بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ میں پانچوں وقت پاکستان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگی جارہی ہیں۔ قبۃ الصخرہ کے مقام پر جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی اُردن کے اُمورِ شرعیہ کے قاضی القضاۃ شیخ عبد اللہ غوشہ نے شہدائے پاکستان کے لیے نمازِ جنازہ ادا کی۔ اور پیغمبروں کے مزاراتِ مقدسہ کے مجاور محمد علی الجابری نے افواجِ پاکستان کو صلوٰۃ الجہاد پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

سوڈانی عوام کی طرف سے پاکستان کی حمایت و تائید میں ملک گیر آوازیں بلند ہوئی ہیں۔ سوڈان کی مقبول ترین سیاسی جماعت "حزب الامۃ" نے، جو اس وقت سوڈان کی حکومت میں بھی شریک ہے، مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کی تمام تجاویز کی حمایت کی ہے۔ خرطوم نیوز سروس نے سوڈان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے بیانات شائع کیے ہیں۔ سوڈان کے اسلامک چارٹر فرنٹ نے کہا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ اسلامی مسئلہ ہے اس لیے فرنٹ اس بارے میں پاکستان کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ اسلامک چارٹر فرنٹ، جو سوڈان کی جماعت اخوان المسلمون اور دوسری سیاسی و مذہبی جماعتوں کے اتحاد سے وجود میں آیا ہے، کے جنرل سکرٹری

ڈاکٹر حسن ترابی نے کراچی پہنچ کر حکومتِ پاکستان کو اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ فرنٹ کے آرگن روزنامہ المیثاق نے اپنے اداریتی تبصرے میں لکھا ہے کہ برِصغیر کی آزادی کے فوراً بعد بھارت نے قوت کے بل پر کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ کشمیری رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور رائے شماری کے انعقاد کی تمام کوششیں مسترد کر دیں۔ اخبار نے لکھا ہے کہ بھارت صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے، اس لیے پاکستان بھی بھارت کے خلاف یہی زبان استعمال کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ المیثاق نے پاکستان کے اس نقطۂ نظر کی پُرزور تائید کی کہ کشمیر میں بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری کرائی جائے۔ سوڈان کی ایک اور ملک گیر تنظیم "انصارِ سنتِ محمدیہ" جہادِ پاکستان کے لیے مالی فنڈ کی پیش کش کر چکی ہے اور اس کے رضاکار جہاد میں شرکت کے لیے پاکستان کے اشارے کے منتظر ہیں۔ انصارِ سنتِ محمدیہ کے صدر شیخ محمد ہاشم ہدیہ، جو مؤتمر کراچی میں سوڈان کی نمائندگی کر چکے ہیں، بھارت کو مذمت کے تار اور خطوط بھجوا چکے ہیں اور اپنی حکومت سے بھی حمایتِ پاکستان کا پُرزور مطالبہ کر چکے ہیں۔ اخوان المسلمون سوڈان کے رہنما رشید طاہر نے جو سوڈان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن اور سابق وزیرِ انصاف ہیں، بھارتی جارحیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا ہے کہ کشمیر صرف کشمیری عوام یا پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ پورے عالمِ اسلام کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ بھارت نے کشمیر میں ناحق خون بہایا ہے اور پاکستان پر جو حملہ کیا ہے اس کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز موجود نہ تھا۔ سوڈان کے سب سے بڑے مذہبی حلقے سلسلہ مہدیہ کے پیشوا سید ہادی المہدی نے کہا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقل امن کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کشمیر میں اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری کرائی جائے۔

لبنان میں اخوان المسلمون کی تنظیم نے، جس کا نام الجماعۃ الاسلامیہ ہے، سفیرِ پاکستان مقیم بیروت کو تار دیا جس میں پاکستان کی پُرزور حمایت کی یقین دہانی اور بھارت کے ناپاک عزائم کی مذمت کی۔ لبنان میں پاکستانی سفیر سے ایک لبنانی وفد نے ملاقات کی۔ وفد نے سفیرِ پاکستان سے کہا کہ تمام اسلامی ممالک کے عوام پاکستانی افواج کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لینے کے لیے تیار

ہیں۔ اس وفد میں الجماعۃ الاسلامیہ کے جنرل سکرٹری فتحی یکن موتمر اسلامی کے بانی اور عراق کے اخوان المسلمون کے لیڈر شیخ محمد محمود صواف میونسپل کونسل مکہ مکرمہ کے صدر نامور اخوانی صحافی صالح محمد جمال مفتی اعظم لبنان کے نمائندے شیخ عبداللہ اور دوسرے دانشور شامل تھے۔ الجماعۃ الاسلامیہ کا مرکز شمالی لبنان کے شہر طرابلس میں ہے۔ اس شہر کی تمام آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ الجماعۃ الاسلامیہ کے رضاکاروں نے اس شہر کے اندر ایک اجلاس منعقد کیا اور پاکستان کو اپنی خدمات پیش کیں۔ طرابلس کے علماء و فضلا کا ایک وفد بیروت میں پاکستانی سفیر سے ملا اور بھارت کے جارحانہ حملے کی شدید مذمت کی اور اپنے غیر مشروط تعاون کا یقین دلایا۔ اس وفد نے جس کی قیادت طرابلس کے نامور عالم دین شیخ سلیمان برودی کر رہے تھے، صدر پاکستان کے نام ایک پیغام بھیجا جس میں بتایا کہ طرابلس کے ہزاروں مسلمان اپنے پاکستانی بھائیوں کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لینے کے لیے اور کفر کی طاقتوں کو کچلنے کے لیے بے چین ہیں۔ ویسے تو لبنان کے طول و عرض میں پاکستان کے لیے بے پناہ جذبات محبت و عقیدت پائے جاتے ہیں لیکن علمائے طرابلس نے پاکستان دوستی کی ایک اور نادر مثال پیش کی۔ انہوں نے اپنے فتووں میں پاکستان کے جہاد کو جہاد اعظم قرار دیا۔ بھارتی سفارت خانے کے نمائندوں نے ان علماء سے ملاقات کی خواہش کی تو اسے مسترد کر دیا اور جب بھارتی نمائندے خود ان کے مکانات پر حاضر ہوئے تو ملاقات سے انکار کر دیا۔

سعودی عرب کے عوام و خواص نے پاکستان کی فتح و نصرت کے لیے جس محبت و اخوت کا اظہار کیا ہے اس کی مثال ملنا محال ہے۔ جب پاکستان پر حملہ ہوا تو مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، ریاض اور دوسرے مقامات پر یوں معلوم ہوتا تھا گویا پاکستان پر نہیں بلکہ سعودی عرب کی مقدس سرزمین پر حملہ ہو گیا ہے۔ سعودی علماء نے باقاعدہ یہ فتویٰ دیا کہ پاکستان کا جہاد ویسا ہی جہاد ہے جیسا کہ بدر، اُحُد اور حنین کا جہاد تھا اور شہدائے پاکستان کا وہی درجہ ہے جو بدر و اُحُد کے شہداء کا تھا۔ سعودی عرب کے شعر و ادب کے حلقوں اور صحافیوں نے جہاد

پاکستان کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ پاکستان کی فتح و نصرت کے لیے کعبۃ اللہ اور روضۂ رسول کے پاس لوگ گھنٹوں گڑگڑا کر دعائیں کر رہے ہیں۔ حرمین کے امام نمازوں میں پاکستان کی کامیابی کے لیے اجتماعی دعائیں کر رہے ہیں۔ لوگوں کے جذبات کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص پاکستان کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو اس کی پٹائی کر دیتے ہیں۔ جدہ کے بھارتی سفارت خانے کے فسٹ سکرٹری کے ساتھ یہ صورت پیش آچکی ہے۔ سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ محمد بن ابراہیم اور مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ عبدالعزیز بن باز نے علماء کی ایک خصوصی میٹنگ میں اہلِ ملک سے پاکستان کی دل کھول کر امداد کرنے کی اپیل کی ہے۔ سعودی عوام نے مختلف شہروں میں فنڈ جمع کرنے کی کمیٹیاں تشکیل کر لی ہیں۔ صرف جدہ سے تین لاکھ تیس ہزار ریال سعودی کی امداد پاکستان کو بھیجی جا چکی ہے۔ مکہ مکرمہ کے دیندار، خلیق اور نیک نفس گورنر امیر مشعل بن عبدالعزیز جو شاہ فیصل کے بھائی ہیں، خود پاکستان پہنچ کر جہاد میں شرکت کی تمنا کر چکے ہیں۔ اخوان رہنما مقیم مکہ مکرمہ شیخ عشماوی احمد سلیمان اور ان کے ساتھی مالی امداد فراہم کرنے میں سعودی اور پاکستانی حلقوں کے دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔ اس امر کی اطلاع موصوف نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ایک خط کے ذریعہ دی ہے۔ شیخ عشماوی حرم مکہ میں روزانہ شام کو کشمیر اور پاکستان کے جہاد کے موضوع پر تقریریں کر رہے ہیں۔

مکہ مکرمہ کی اسلامی تنظیم رابطۂ عالم اسلامی نے بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ رابطہ کی طرف سے ۲۴ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو یہ اپیل بھیجی گئی ہے کہ وہ پاکستان کے تحفظ اور بھارت کی جارحیت کے انسداد کے لیے پاکستان کی اخلاقی اور مادی امداد کریں۔ یہ اپیل جن ممالک کو بھیجی گئی ہے اُن میں ملائشیا بھی شامل ہے۔ رابطہ نے کاسابلینکا میں منعقدہ عرب سربراہوں کی کانفرنس کے نام بھی ایک تار بھیجا اور پاکستان اور کشمیر کے حق خود ارادیت کی حمایت کا مطالبہ کیا۔ رابطہ کے سکرٹریٹ میں مکہ اور دوسرے مقامات کے نمایاں اصحاب جمع ہوئے اور ایک نمائندہ اجلاس میں پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا گیا ہے۔ رابطہ دنیائے اسلام کی

ایک نمائندہ تنظیم ہے اور ایشیا کے علاوہ افریقہ کی آزاد مسلم ریاستوں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی مسلم اقلیتوں کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔

عراق، کویت، قطر اور خلیج عرب کی دوسری عرب یاستوں کے مسلم عوام کا بھی یہی حال ہے۔ ہر جگہ پاکستان کی حمایت میں جذبات کا ایک سمندر موجزن ہے۔ عراق کے مجاہد اعظم شیخ امجد الزہاوی، جو عراق کے سابق چیف جسٹس (امورِ شرعیہ) اور رابطۂ علمائے عراق کے صدر ہیں، ان تمام عرب سربراہوں سے جہادِ پاکستان کی حمایت و تائید کا مطالبہ کر چکے ہیں جو کاسابلینکا کی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ شیخ زہاوی نے صدر پاکستان کے نام اپنے خط میں لکھا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان پاکستان پر بھارت کے حملے کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ شیخ امجد الزہاوی قیام پاکستان کی تحریک کی بھی عرب دنیا میں پُرزور حمایت کرتے رہے ہیں۔ عراق اور کویت کا پورا پریس پاکستان کی تائید و حمایت کر چکا ہے۔ عراق کے نامور اسلام پسند صحافی حیدر ظفر الفیاض ایڈیٹر الفجر الجدید نے جہادِ پاکستان میں حصہ لینے کی اجازت مانگی ہے۔ کویت کے اخبار "الکویت" نے لکھا ہے کہ آنجہانی وزیر اعظم نہرو نے بھی جو قوموں کے حق خود ارادیت کے مدعی بنتے تھے، کشمیر میں استصواب کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ کویت کے ایک اور جریدہ "صوت الخلیج" نے لکھا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کا دارومدار کشمیری عوام پر ہے۔ یہ مسئلہ انہی کی مرضی کے مطابق حل ہونا چاہیے۔ ایک اور اخبار "العالم الملکی" نے اوتھان کے مشن پر نکتہ چینی کی۔

شام کے ایک ممتاز عالمِ دین اور شام کی عربک اکیڈیمی کے شعبۂ اسلامیات کے صدر شیخ بہجت البیطار نے مولانا مودودی کو جو خط لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے سے پورے شام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اور علماء اور مشائخ بھارت کی مذمت اور پاکستان کی حمایت میں متواتر تقریریں کر رہے ہیں۔ علماء کی جماعت نے شامی عوام سے پاکستان کی مالی امداد کی بھی اپیل کی ہے۔ شیخ بہجت البیطار نے یہ بھی لکھا ہے کہ دمشق کے علماء کا ایک نمائندہ وفد تمام عرب اور مسلم ممالک کے سفارت خانوں میں گیا اور اُس نے بھارتی جارحیت کے

خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا اور انہیں بتایا کہ پاکستان پر حملہ تمام عالمِ اسلام پر حملہ ہے۔ وفد نے سفارت نمائوں کے سربراہوں پر زور دیا کہ وہ اپنی حکومتوں کو شامی عوام کے جذبات سے آگاہ کردیں اور اقوامِ متحدہ پر بھی زور دیں کہ وہ مسئلہ کشمیر کو اپنی سابقہ قرار دادوں کے مطابق حل کرے۔ اس وفد نے جس کے قائد شام کے مفتی اعظم شیخ احمد کفتارو تھے اُن ممالک کے سفارتی نمائندوں سے بھی ملاقات کی جنہوں نے پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور اس حمایت پر انہیں مبارکباد دی۔ مفتی اعظم نے صدر پاکستان کے نام ایک تار بھی ارسال کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شام کے مسلمان پاکستان کے جہاد میں شرکت کے لیے تیار ہیں۔ شام میں لاتعداد مسلمانوں کی تحریری درخواستیں موصول ہو رہی ہیں جن میں یہ پیش کش کی گئی ہے کہ ان کے نام پاکستان کی فوج میں درج کیے جائیں۔ دمشق کے علماء نے اپنی حکومت سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کی حمایت کرے۔ شام کی جمعیۃ العلماء کے صدر شیخ مکی الکتانی نے بھی پاکستان کے سفیر سے ملاقات کی اور کہا کہ: شام کے علماء پاکستان کے جہاد میں شریک ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔ شیخ نے کہا وہ مسلمان پہلے ہیں اور عرب بعد میں۔ پاکستان اس وقت بھارت کے خلاف جو جنگ لڑ رہا ہے وہ تمام مسلمانوں کی جنگ ہے۔ شیخ مکی الکتانی رابطہ عالم اسلامی کی مجلسِ تاسیسی کے بھی رکن ہیں۔

مراکش کی استقلال پارٹی نے جہادِ پاکستان اور کشمیر کے حقِ خود ارادیت کی مکمل تائید کا اعلان کیا ہے۔ استقلال پارٹی کے سربراہ علامہ علال الفاسی نے ایک جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان ایشیا کے اندر دنیائے اسلام کی رُوح اور ملت اسلامی کی جہد للبقا کا عکاس ہے۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو جنگ جاری ہے یہ اُسی نوعیت کی جنگ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سامری کے درمیان ہوئی تھی۔ یعنی وہ جنگ جس کا ایک فریق گائے کو ذبح کر کے کھانے والا تھا اور دوسرا گائے کا پجاری۔ اور آج وہ انسانی تہذیبیں جو مسیحیت، یہودیت اور اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں ایشیائی سامریوں کے مقابلے کی آزمائش سے دوچار ہیں۔ موصوف نے اس جنگ کو نظریاتی جنگ قرار دیتے ہوئے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جس طرح

پاکستان ایک نظریہ کی اساس پر وجود میں آیا ہے، اسی طرح برما اور لنکا بھی نظریات کی اساس پر وجود پذیر ہوئے ہیں لیکن ہندوستان کے رہنما برما اور لنکا کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں کرتے جب کہ پاکستان کے معاملے میں وہ تخریب پسندانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ علامہ علال الفاسی نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اگر کوئی طاقت اس پاک سرزمین پر حملہ آور ہو تو ہم اس کی مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ علامہ علال الفاسی نے ترکی، ایران اور انڈونیشیا کی تعریف کی کہ ان ملکوں نے اپنے داخلی نظام اور خارجی سیاست کے اختلاف کے باوجود پاکستان کی حمایت و تائید کی ہے۔ اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ روحانی رابطہ دلوں کے اندر اس قدر مستحکم ہے کہ ظاہری اختلافات اس کے ظہور میں حارج نہیں ہو سکتے۔ استقلال پارٹی کے صدر نے تقریر کے آخر میں کہا: ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے، عرب ہونے کی حیثیت سے، پُرامن باہم وجودیت کے حامی ہونے کی حیثیت سے، افریشیائی اتحاد کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے عرب حکام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ حملہ آور قوت کو روکا جائے اور اسلامی ممالک کے تحفظ و استقلال کو قابلِ تقدیس قرار دیا جائے موصوف نے اپنی پارٹی کی طرف سے یہ یقین دلایا کہ یہ پارٹی خود ارادیت کے حق کے بارے میں کشمیری مسلمانوں کی پوری پوری حمایت کرتی ہے اور اس کا تمام تر تعاون و ہمدردی پاکستان کے ساتھ ہے۔ علال الفاسی نے تمام بہی خواہانِ انسانیت سے بھی یہی اپیل کی۔ موصوف کی یہ تقریر مراکش کے روزناموں میں چھپ چکی ہے۔

علال الفاسی مراکش کے جہادِ آزادی میں قابل قدر خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ موصوف عبدالکریم ریفی کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ جامعۂ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑے آزمودہ کار سیاست دان، وسیع النظر عالم دین، اور شعلہ بیان خطیب ہیں۔ متعدد علمی اور تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں سراکش کی وزارتِ اوقاف و امور مذہبی کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں۔ قاہرہ کی عربک اکیڈمی اور رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ کی مجلس تاسیسی کے ممبر ہیں۔

استقلال پارٹی موصوف جس کے صدر ہیں مراکش کی سب سے بڑی اسلامی اور قومی تنظیم ہے، یہ پارٹی مراکش کے اندر احیائے اسلام کے لیے کوشاں ہے۔ استقلال پارٹی نے نہ صرف خود جہادِ پاکستان کی حمایت کی ہے بلکہ مراکشی عوام سے بھی اس جہاد کی تائید کی اپیل کی ہے اور کاسا بلینکا میں منعقدہ عرب سربراہوں کی حالیہ کانفرنس سے بھی بذریعہ تار پاکستان کی واضح حمایت کا مطالبہ کیا ہے۔ اسی مطالبے کا اعادہ عرب لیگ سے بھی کر چکے ہیں۔

علال الفاسی کی مذکورۃ بالا تقریر اور استقلال پارٹی کا بیان استقلال پارٹی کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک ممبر استاذ ابوبکر القادری نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ارسال کیا ہے۔ استاذ ابوبکر القادری نے جو خود بھی نمایاں عالمِ دین، نوجوانوں کی انجمن احیائے اسلام کے صدر اور ماہنامہ "ایمان" کے مدیر ہیں، مولانا مودودی کے نام اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ وہ پچھلے سال ماہ مارچ میں بنڈونگ کی اسلامی کانفرنس میں شریک تھے اور اس کانفرنس میں انہوں نے عالمِ اسلامی کے دوسرے مسائل کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ بھی اٹھایا تھا۔ اسی طرح حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں جو عالمگیر اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں انہوں نے کشمیر کے حقِ خودارادیت کے لیے مؤثر قرارداد منظور کرانے کے لیے پوری تگ و دو کی تھی۔ استاذ ابوبکر القادری نے لکھا ہے کہ کشمیر اور پاکستان کا مسئلہ آج کل مراکش اور شمالی افریقہ کے تمام مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور یہاں کی تمام جماعتوں نے اسے اوّلین اہمیت دے رکھی ہے۔ مسلم عوام کی تمام ہمدردیاں اور دعائیں پاکستان کے ساتھ ہیں۔

تونس اور الجزائر کی حکومتوں کی طرف سے بھی کشمیر کے حقِ خودارادیت کی حمایت کا اعلان ہو چکا ہے۔ قاہرہ کی حکومت کا موقف اگرچہ مبہم رہا ہے لیکن قاہرہ کے بعض اخبارات پاکستان اور کشمیر کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ ازہر کے ریکٹر شیخ حسن مامون پاکستان کی کامیابی کی دعا کر چکے ہیں۔ لنکا کی اسلامی جماعت نے بھی حمایت کی ہے۔ بلکہ ہمیں یقین ہے کہ ملائشیا کے مسلم عوام کی ہمدردیاں بھی ہمارے ساتھ ہیں اور وہ یقیناً اپنی حکومت کے احمقانہ موقف کا ماتم کر رہے ہونگے۔

نائیجیریا کے عوام نے بھی پاکستانی جہاد کی حمایت کی ہے۔ نائیجیریا کی اسلامی تنظیموں "نصر الاسلام پارٹی اور "مسلم کونسل آف نائیجیریا" کے زیر اہتمام متعدد تقریبوں میں پاکستان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں کی گئیں۔ آتشیں اسلحہ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی کامیابی میں دعاء کے اسلحہ نے بھی بہت کام کیا ہے۔ جس جمعہ کو بھارت کے طیارے فقیر ٹیے والا (قصور) اور سیالکوٹ اور سرگودھا کے شہریوں پر بم برسا رہے تھے عین اُس تاریخ کو کروڑوں بندگانِ خدا اپنے بھائیوں کے تحفظ کے لیے بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز تھے۔ حرمِ کعبہ میں دعائیں مانگی جا رہی تھیں، حرمِ نبوی میں آہ و بکا کا سلسلہ جاری تھا۔ حرمِ ابراہیمی (فلسطین) میں آنسو بہ رہے تھے۔ پیغمبروں کے مزارات پر خدا سے التجائیں ہو رہی تھیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری (استنبول) کے مزار پر مرد و زن کے ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھے ہوئے تھے۔ خرطوم اور دمشق دست بدعا تھے۔ نائیجیریا کی نصر الاسلام اور مسلم کونسل کے رہنما عوام کو دعاء کی تلقین کر رہے تھے۔ مشہد اور نجف اشرف میں گریہ و زاریاں ہو رہی تھیں ـــ ان اسلحہ کے ہوتے ہوئے پاکستان کو کون شکست دے سکتا ہے!

آخر میں ہم اس سلسلہ کی چند ایک تجویزیں بھی پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اولاً: حکومتِ پاکستان کے محکمہ اطلاعات نے جنگ کی جو دستاویزی فلم تیار کی ہے اُسے نمائش کے لیے عرب ممالک اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ضرور بھیجا جائے۔ اس فلم کی کومنٹری کا عربی ترجمہ کیا جائے۔ عرب ممالک کے لیے یہ فلم پوری طرح تب ہی مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے کہ اس کے تمام مناظر کی تشریح خود اُن کی اپنی زبان میں کی جائے۔ ثانیاً: جنگ کی تاریخ پر جو کتاب مرتب کی جا رہی ہے اُس کا ترجمہ بھی فی الفور عربی میں ہونا چاہیے۔ یہ کتاب انشاء اللہ مسلم اقوام کے نہ صرف حمایتِ حق کے جذبات کو دو آتشہ کرے گی بلکہ ان کی ایمانی اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی نہایت کارگر ثابت ہو گی۔ ثالثاً: کشمیر کے مسئلہ پر ایک جامع اور مدلل کتاب تیار کی جائے۔ پاکستانی سفارت خانوں کی طرف سے اب تک اس مسئلہ پر جو لٹریچر چھپا ہے اُسے ہم نے دیکھا ہے۔ ہماری

ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ وہ لٹریچر اپنی زبان اور اپنے مواد کے لحاظ سے قطعاً مؤثر نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک ایسی مصوّر کتاب شائع کی جائے جس سے ایک عرب آسانی سے کشمیر کا مقدمہ، پاکستان کا موقف اور یو۔این۔او کے فیصلے سمجھ سکے۔ پاکستان کا موقف اس قدر صاف، واضح اور حق پرستانہ ہے کہ اگر سیاسی، اخلاقی، تاریخی اور جغرافی حیثیت سے اُسے سلجھی ہوئی زبان میں پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بھارت کے پروپگنڈے کی دال گل سکے۔ مسلم اقوام نے اگرچہ اب بھی کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کی حمایت کی ہے لیکن اگر ان کو اس حمایت کے واضح دلائل بھی میسر آجائیں تو نہ صرف ان کے یقین و ایمان میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ بھارت کے ایجنٹوں کا بھی منہ توڑ جواب دیتے رہیں گے۔ رابعاً، اس موقع پر اگر یہ ممکن ہو کہ مسلمان ممالک کے چیدہ چیدہ صحافیوں کو پاکستان کے دورہ کی دعوت دی جاسکے، تو ضرور دی جانی چاہیے۔ جب یہ لوگ یہاں آکر ایک طرف افواجِ پاکستان کی جرأت و بہادری کے کارناموں اور دوسری طرف بھارت کی وحشیانہ کارروائیوں کو دیکھیں گے اور اپنے تاثرات و مشاہدات اپنے عوام تک منتقل کریں گے تو انہیں پاکستان کی اخلاقی و ایمانی برتری کے ساتھ ساتھ بھارت کے ننگِ انسانیت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ خامساً، عربی اور انگریزی زبان میں جلدی سے جلدی ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ تقسیم کے زمانہ سے لیکر اب تک ہندوستان کی حکومت اور وہاں کے ہندو عوام نے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم و ستم ڈھائے ہیں۔ یہ داستان اگر مضبوط شواہد اور دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ شائع ہو جائے تو انشاءاللہ بھارت مسلم ممالک میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اِس طرح کی چیزیں جب تک عمدہ عربی زبان میں نہ لکھی جائیں گی۔ ان کو شائع کرنے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

رسائل و مسائل

صلوٰۃِ خوف

سوال: جو افواجِ پاکستان اپنے پاک وطن کے دفاع کے لیے محاذ پر برسرِ پیکار ہیں، ان کے بارے میں نماز فرض کا کیا حکم ہے؟ موجودہ حالات میں فرض نماز کے ادا کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: اگر عملاً لڑائی نہ ہو رہی ہو، بلکہ فوجی دستہ محاذ جنگ کی کسی چوکی پر صرف مدافعت کے لیے مستعد بیٹھا ہو تو ایسی حالت میں صلوٰۃِ خوف با جماعت اس طرح ادا کی جائے کہ پہلے آدھے سپاہی ایک جگہ جمع ہو کر فرض نماز قصر[1] ادا کریں، اور پھر باقی آدھے نماز ادا کر لیں۔ نماز کے وقت سپاہیوں کو اپنے ہتھیار اپنے ساتھ رکھنے چاہییں۔

اگر دشمن کے حملے کا فوری خطرہ ہو اور کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکتا ہو تو پھر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے، بلکہ جو سپاہی جس جگہ ہو اور جس حال میں ہو، بیٹھے، کھڑے یا لیٹے ہوئے اشاروں سے، صرف فرض نماز قصر کے ساتھ ادا کر لے۔ اس حالت میں قبلہ رُخ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز نہ پڑھی جا سکتی ہو تو صرف نیت قبلے کی طرف منہ کر کے باندھ لی جائے اور پھر جدھر بھی جنگی ضرورت کے لیے رُخ کرنا پڑے اسی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ رکوع و سجدہ نہ ہو سکے تو صرف اشاروں سے ہی نماز پڑھ لی جائے۔ دورانِ نماز میں اگر دشمن حملہ کر دے تو اسی حالت میں فائر کر سکتے ہیں۔ البتہ اگر اپنی جگہ سے حرکت کرنا اور ساتھیوں سے بات کرنا ضروری ہو تو پھر نماز توڑ دیں اور اس کی قضا بعد میں جب موقع

---

[1] قصر سے مراد یہ ہے کہ چار فرض کے بجائے دو پڑھے جائیں۔ چار رکعت سے کم فرائض میں قصر نہیں ہے۔ سنت میں بھی قصر نہیں ہے، لیکن حالتِ سفر میں سنت نہ پڑھنا موجبِ مواخذہ نہیں۔

ہو ادا کریں۔

اگر عملاً معرکۂ کارزار گرم ہو جائے اور نماز پڑھنے کا بالکل موقع ہی نہ مل رہا ہو تو پھر نماز قضا کی جا سکتی ہے۔ ان حالات میں جتنی نمازیں بھی قضا ہوں انہیں معرکہ ختم ہونے کے بعد ادا کر لیا جائے۔

غذاؤں کی حرمت و حلّت

سوال۔ مَیں ایک عرصے سے انگلستان میں مقیم ہوں۔ یہاں اہلِ فرنگ سے جب کبھی مذہب کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے یہ لوگ اکثر سؤر کے گوشت کی بابت ضرور گفتگو کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اسلام میں اسے کیوں حرام کیا گیا ہے؟ مَیں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس معاملے میں میری رہنمائی فرمائیں اور واضح کریں کہ قرآن کی رُو سے اس گوشت کی ممانعت کس بنا پر کی گئی ہے اور اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب ۔ سُؤر کے گوشت کو جس طرح قرآن میں منع کیا گیا ہے اسی طرح بائیبل (عہدنامۂ قدیم) میں بھی منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہودی آج بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ عہدنامۂ جدید میں بھی خود حضرت عیسٰی نے کہیں یہ نہیں کہا کہ بائیبل کا یہ قانون منسوخ کر دیا گیا ہے۔ وہ سینٹ پال تھا جس نے عیسائیت کو مغربی اقوام میں پھیلانے کے لیے شریعت کی قیود توڑ ڈالیں اور جو کچھ خدا نے حرام کیا تھا اسے حلال کر دیا۔ خدا کی شریعت میں تو سؤر ہمیشہ سے حرام رہا ہے۔

جن چیزوں کی مضرت انسان اپنے تجربات سے خود جان لیتا ہے ان کے متعلق خدا کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کا علم حاصل کرنے کے لیے انسان کے اپنے ذرائع علم کافی ہیں۔ اسی لیے خدا کی شریعت میں سنکھیا کی حرمت نہیں بیان کی گئی۔ مگر جن چیزوں کی مضرت جاننے کے ذرائع انسان کو حاصل نہیں ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ان سے پرہیز کرو۔ ہمارے لیے عقل مندی یہی ہے کہ ہم خدا پر بھروسہ کر کے ان سے پرہیز کریں تاکہ ان کے نقصان سے بچ سکیں

حقیقت یہ ہے کہ غذاؤں کا اثر صرف انسان کے جسم ہی پر نہیں پڑتا بلکہ اس کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔ جسم پر پڑنے والے اثرات کو تو ہم اپنے تجرباتی علوم سے معلوم کر لیتے ہیں اور بہت کچھ کر چکے ہیں، مگر اخلاق پر غذاؤں کے جو اثرات پڑتے ہیں ان کا علم اس وقت تک بھی انسان کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ خدا کی شریعت میں سؤر، مُردار، خون اور درندوں کی حرمت اسی لیے بیان کی گئی ہے کہ انسانی اخلاق پر ان غذاؤں کا بُرا اثر پڑتا ہے۔

وجودِ باری کے متعلق ایک سوال

سوال۔ ذیل کا سوال میرے عزیز دوست کے ذہن میں عرصے سے کھٹک رہا ہے میں نے بہت کوشش کی لیکن صحیح جواب نہ دے سکا۔ امید ہے کہ جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

"اللہ تعالیٰ کیسے وجود میں آیا؟ جبکہ ہر موجود کے لیے عقلاً کسی موجد کا ہونا نہایت ضروری ہے"

جواب: جس طرح عقل یہ چاہتی ہے کہ کسی وجود کے لیے ایک موجد ہو، اسی طرح عقل یہ بھی چاہتی ہے کہ تمام کائنات کا موجد کوئی ایسا وجود ہو جو کسی موجد کے بغیر آپ سے آپ موجود ہو، ورنہ ہر موجود کے لیے ایک موجد درکار ہوگا اور یہ سلسلہ کہیں جا کر نہ رُکے گا۔ خدا تو کہتے ہی اس کو ہیں جو سب کا خالق ہو اور خود کسی کا مخلوق نہ ہو۔ اگر وہ مخلوق ہو تو وہ خدا نہ ہوگا، بلکہ جس نے اس کو خلق کیا ہو وہی خدا ہوگا۔

(بقیہ اشارات)

ہوں انہیں اہم اور کلیدی مناصب نہ سونپے جائیں۔ ہماری درسگاہوں اور تمام تعلیمی اور تربیتی اداروں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق کی تربیت کا بھی پورا پورا انتظام کیا جائے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری حکومت قوم کے اخلاق سنوارنے کی طرف پوری توجہ دے۔ اس کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اُن اسباب کو ختم کر دیا جائے جن سے پوری قوم کے اندر جرائم ایک طوفان کی طرح بڑھ رہے تھے۔ پھر مثبت طور پر اُن ساری تدابیر کو کام میں لایا جائے جن سے قوم اخلاقی اعتبار سے مستحکم اور مضبوط ہو۔

یوں تو ہماری اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں انقلابی اصلاحات کی اشد ضرورت ہے مگر رشوت خوری ہماری انتظامیہ کے رگ و پے میں جس طرح سرایت کیے ہوئے ہے وہ انتہائی تشویشناک ہے اور ان مخدوش حالات میں ہمیں اس کے استیصال کی سخت فکر کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے نہ ہماری سرکاری مشینری کی استعداد کار بڑھ سکتی ہے اور نہ عوام کو عدل و انصاف حاصل ہو سکتا ہے۔ جب حکومت کے کل پرزے دیانتداری سے کام نہ کریں گے تو لوگوں کے اندر اُس کے بارے میں بے اعتمادی پیدا ہو گی جو کسی وقت بھی غیر معمولی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوام کو حکومت پر پورا اعتماد ہو اور حکومت عوام پر پوری طرح بھروسہ کر سکے۔ رشوت خوری اور اقربا نوازی سے اس باہمی اعتماد کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ یہی خود غرضانہ ذہنیت جو رشوت خوری کی تہ میں کام کرتی ہے سمگلنگ اور چور بازاری میں بھی کارفرما ہوتی ہے۔ اسے پوری قوت سے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ جو شخص یا گروہ ناجائز مال و متاع کے حصول کے لیے اپنے ایمان اور ضمیر کا خون کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اس سے کوئی بعید نہیں کہ طمع و لالچ میں آ کر وہ ملکی مفادات کو بے دریغ قربان کر دے۔ جو لوگ رشوت خوری

کے عادی ہیں وہ اگر اپنے اہلِ وطن سے ہزار روپیہ لے کر بددیانتی کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو ان سے کچھ بعید نہیں ہے کہ دشمن لاکھ روپیہ دے کر ان سے اور زیادہ خطرناک کام نہ لے لے جب ایک شخص اپنے ایمان کو منڈی کا مال بنا چکا ہو تو پھر اُسے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ اس کا کس کے ہاتھ سودا کرتا ہے۔ جو اُسے اس کے زیادہ سے زیادہ دام ادا کرنے کے لیے تیار ہو گا وہ اُسے اسی کے ہاتھ فروخت کر دیگا۔ لہٰذا یہ ازبس ضروری ہے کہ آج تک انسدادِ رشوت کے نام سے جو کچھ کیا جاتا رہا ہے اُسے کافی نہ سمجھا جائے اور اس مسئلہ کا پوری گہرائی کے ساتھ جائزہ لے کر اس کے قلع قمع کی فکر کی جائے۔

اسی ضمن میں آخری بات ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ دور میں جنگ کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ اب دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف باقاعدہ فوج کی ہنرمندی اور اس کی شجاعت و جاں نثاری ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہر فرد کی خدمت کی ضرورت ہے۔ جب تک پوری قوم ملک کی پاسبانی کے لیے ہر طرح تیار نہ ہو اس وقت تک اس کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ اس بنا پر یہ انتہائی ضروری ہے کہ پوری قوم کو فوجی تربیت دے کر اُسے مناسب اسلحہ سے لیس کر دیا جائے اور اس بات کا پورا طرح اہتمام کیا جائے کہ اس کے اندر عیش پرستی کی جو بُری عادات جڑ پکڑ چکی ہیں ان کا یکسر خاتمہ ہو اور ان کی جگہ یہ قوم اپنے اندر سپاہیانہ خصائل پیدا کر کے جفاکشی کی زندگی بسر کرنے کی عادی بنے۔

خالی صفحه

خــــالی صفحــــه